قرآنی نظامِ ربوبیت کا پیامبر

طلوعِ اسلام

اس شمارہ میں

۱۔ کیسا حسین تھا یہ خواب ؟!

۲۔ تحریکِ پاکستان اور پرویز

۳۔ Genesis & Ideology of Pakistan

اگست

1989

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

لمعات

ستاون ویں یومِ آزادی پر

اقوامِ مغرب کے اعصاب پر صدیوں تک شخصی حکومت کا عفریت اور نظامِ کلیسا (تھیاکریسی) کا بھوت سوار رہا۔ انہوں نے بال آخر تنگ آ کر ان کے پنجۂ فولاد سے اپنے آپ کو چھڑایا تو ان کی جگہ ایک اور نظامِ حکومت کی طرح ڈالی، جسے انہوں نے جمہوریت کہہ کر پکارا۔ اس نظام کی پیدا کردہ خوش فہمیوں کی کیفیت یہ تھی کہ انہوں نے ساری دنیا میں ڈھنڈورا پیٹنا شروع کر دیا کہ ابنِ آدم جس جنت سے نکالا گیا تھا، انہوں نے اس کا سراغ پھر سے پا لیا ہے، اور اب انسانی اقتدار کے ہاتھوں کا ستایا ہوا انسان فردوس بداماں زندگی بسر کرے گا۔ جس میں یہ کسی کا محکوم نہیں ہوگا۔ جمہوریت وہ نظامِ حکومت ہے جس میں سب مل کر اپنی مرضی اور منشاء کے مطابق حکومت قائم کرتے ہیں۔ یہی وہ نظام ہے جس میں انسانیت حقیقی آزادی سے ہمکنار ہوگی۔

اقوامِ مغرب، اور ان کی اندھی تقلید میں دنیا کی دوسری قومیں، اس دریافت پر جشنِ مسرت منا رہی تھیں۔ لیکن خطۂ پنجاب کے ایک گوشہ میں بیٹھا ہوا ایک دانشور، جس کی بصیرت نے قندیلِ آسمانی سے اکتسابِ ضیاء کیا تھا، زیرِ لب مسکرا رہا تھا۔ جب اس سے اس کی وجہ پوچھی گئی تو اس نے کہا کہ میں ان فریب خوردہ قوموں کی اس سادہ لوحی پر محوِ حیرت ہوں جو اتنا بھی نہیں سمجھتیں کہ ؎

ہے وہی سازِ کہن مغرب کا جمہوری نظام
جس کے پردوں میں نہیں غیر از نوائے قیصری
دیوِ استبداد جمہوری قبا میں پائے کوب
تُو سمجھتا ہے یہ آزادی کی ہے نیلم پری

اور اس کے بعد اس نے بآوازِ بلند کہا کہ ؎

اس سرابِ رنگ و بو کو گلستاں سمجھا ہے تُو
آہ اے ناداں! قفس کو آشیاں سمجھا ہے تُو

سُننے والوں نے اسے سنا اور ایک شاعر کا تخیل کہہ کر آگے بڑھ گئے۔ لیکن اس نئے نظام کا تجربہ کرتے ہوئے زیادہ عرصہ نہیں گزرا تھا کہ اس کے نتائج کو دیکھ کر خود مغرب کے اہلِ فکر و نظر چلا اٹھے اور انہوں نے پکار پکار کر کہنا شروع کر دیا کہ ہم پھر مبتلائے فریب ہو گئے۔ یہ نظام تو

سابقہ نظاموں سے بھی زیادہ مستبد اور گلوگیر ہے۔ (مثلاً) لندن یونیورسٹی کے پروفیسر ایلفرڈ کوبن نے اپنی کتاب (The Crisis of Civilization) میں نظامِ جمہوریت پر کڑی تنقید کی اور بحث کو سمٹاتے ہوئے لکھا کہ:

> ہم اپنی دلیل کو دو فقروں میں سمیٹ دیتے ہیں۔ ڈیماکریسی کا اصول بتایا یہ جاتا ہے کہ اس میں اقتدارِ اعلیٰ عوام کو حاصل ہوتا ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ عمومی منشاء اپنا مستقل وجود رکھتا ہے۔ اس نظریہ کو صحیح تسلیم کرنے کا منطقی نتیجہ آمریت ہے۔ تاریخ شروع سے آخر تک یہی بتاتی ہے۔

پروفیسر کوبنؔ کا مطلب یہ ہے کہ جسے عوام کا منشاء کہہ کر لوگوں کو فریب دیا جاتا ہے وہ درحقیقت برسراقتدار طبقہ کی آمریت ہوتی ہے۔ اس میں جو شخص یا جو گروہ کسی طرح اکثریت حاصل کر لے اس کے اختیارات حدود فراموش ہو جاتے ہیں۔ جنہیں کوئی طاقت چیلنج نہیں کر سکتی۔ اسی کو ڈکٹیٹرشپ یا آمریت کہا جاتا ہے۔ وہ اپنے اس نظریہ کی وضاحت کرتے ہوئے لکھتا ہے:

> اس نظریہ کو اگر بنظرِ امعان دیکھا جائے تو ''عوام کے اقتدارِ اعلیٰ'' کا فریب نکھر کر سامنے آ جاتا ہے۔ اگر سیاست کو نظری حیثیت سے نہیں، عملی حیثیت سے دیکھا جائے تو یہ ماننا پڑے گا کہ حاکم اور محکوم کو ایک ہی تصور کرنا عملی ناممکنات میں سے ہے۔ حاکم اور محکوم کبھی ایک نہیں ہو سکتے۔ یہ سمجھ لینا کہ دونوں ایک ہی ہیں۔ اسٹیٹ کو بدترین قسم کی آزادیٔ اختیارات دے دیتا ہے۔

انہی خطوط پر ایک اور مفکر (Rene Guenn) لکھتا ہے:

> اگر لفظِ جمہوریت کی تعریف یہ ہے کہ لوگ خود اپنی حکومت آپ قائم کریں، تو یہ ایک ایسی چیز کا نام ہے جس کا وجود ناممکنات سے ہے، اور جو نہ کبھی پہلے وجود میں آئی ہے اور نہ آج کہیں موجود ہے۔ ایسا کہنا ہی جمع بین النقیضیں ہے کہ ایک ہی قوم بیک وقت حاکم بھی ہو اور محکوم بھی..... حاکم اور محکوم کا تعلق دو الگ الگ عناصر کے وجود کا متقاضی ہے۔ اگر حاکم نہیں تو محکوم بھی نہیں۔ ہماری موجودہ دنیا میں جو لوگ کسی نہ کسی طرح قوت اور اقتدار حاصل کر لیتے ہیں، ان کی سب سے بڑی کامیابی اس میں ہوتی ہے کہ وہ لوگوں کے دلوں میں عقیدہ قائم کر دیں کہ ان پر کوئی حاکم نہیں، بلکہ وہ خود اپنے آپ پر حاکم ہیں۔ عام رائے دہندگی کا اصول اسی فریب دہی کی خاطر وضع کیا گیا ہے۔ اس اصول کی رو سے سمجھا یہ جاتا ہے کہ قانون، اکثریت کی مرضی سے وضع ہوتا ہے اور اس حقیقت کو نظرانداز کر دیا جاتا ہے کہ اکثریت کی یہ مرضی ایک ایسی شے ہے جسے نہایت آسانی سے ایک خاص رخ پر بھی لگایا جا سکتا ہے، اور بدلا بھی جا سکتا ہے۔

(The Crisis of the Modern World)

اسی طرح ایک اور مفکر (H.J. Mencken) کہتا ہے:

تمام ناکامیوں میں سب سے بڑی ناکامی خود انسان کی ہے۔ اس انسان کی جو سب سے زیادہ مدنی الطبع حیوان اور سب سے زیادہ عقل مند ہے اور وہ ناکامی یہ ہے کہ یہ اپنے لئے آج تک کوئی ایسا نظام وضع نہیں کر سکا جسے دور سے بھی اچھی حکومت کہا جا سکے۔ اس نے اس باب میں بڑی بڑی کوششیں کی ہیں۔ بہت سی ایسی جو فی الواقع محیر العقول ہیں اور بہت سی ایسی، جو بڑی جرأت آزما تھیں۔ لیکن جب ان کی عملاً تنفیذ کا وقت آیا تو نتیجہ حسرت و یاس کے سوا کچھ نہ تھا۔ اس کا سبب یہ ہے کہ نظری طور پر حکومت کا خاکہ کھینچ لینا اور بات ہے اور عملی طور پر اسے نافذ کرنا اور بات۔ نظری طور پر حکومت اس کے سوا کچھ نہیں کہ یہ افراد مملکت کی ضروریات زندگی مہیا کرنے کا ذریعہ ہے اور اربابِ حکومت پبلک کے خادم ہیں۔ لیکن درحقیقت حکومت کا فریضہ پبلک کی خدمت نہیں، بلکہ سلب و نہب ہوتا ہے.....اس باب میں مختلف اسالیب حکومت میں سب سے زیادہ ناکام نظام جمہوریت رہا ہے۔ جمہوری نظام کے ارباب حل وعقد خوب جانتے ہیں کہ حکومت کی بنیاد معقولیت پر ہونی چاہئے لیکن ان کا جذبۂ محرکہ کبھی معقولیت پسند نہیں ہوتا۔

(Treatise on Right and Wrong)

یہ ہے وہ آخری نظام، جسے فکر انسانی وضع کر سکا ہے اور جسے جنت ارضی قرار دیا جاتا ہے۔ آپ کہیں گے کہ اس کا علاج کیا ہے؟ اور اس کا جواب یہ ہے کہ اس کا علاج ہے قرآن کا سیاسی نظام۔ اس نظام کی تفاصیل کتنی ہی طول طویل کیوں نہ ہو، اس کے اساسی اصول نہایت مختصر ہیں۔ یعنی:

(۱) اس کا (Constitution) کسی انسان کا مرتب کردہ نہیں، خدا کا عطا فرمودہ ہے۔ یعنی خدا کی کتاب۔

(۲) یہ (Constitution) ہر لحاظ سے مکمل ہے اور کسی کو حق حاصل نہیں کہ اس میں کسی قسم کا حک و اضافہ یا تغیر و تبدل کر سکے۔ 6:116))

(۳) اس کے احکام کا اطلاق تمام افراد پر یکساں ہوتا ہے اور بڑی سے بڑی شخصیت بھی اس سے مستثنیٰ قرار نہیں پا سکتی۔ چنانچہ اور تو اور، خود حضور رسالتمآب صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے بھی (ارشاد خداوندی کی رو سے) اعلان کر دیا کہ اگر میں بھی اس کی خلاف ورزی کروں تو اس کے مواخذہ سے نہیں بچ سکتا۔ (10:15)

(۴) جو قانون بھی اس کے خلاف ہو اسے آئینی سند حاصل نہیں ہو سکتی، کیونکہ خود اس آئین میں یہ شق موجود ہے کہ جو شخص بھی اس کے مطابق فیصلہ نہیں کرے گا اسے کافر قرار دیا جائے گا۔ ((5:44

(۵) عدالتیں بھی اس کی پابند ہوں گی کہ وہ انہی قوانین کی رو سے مقدمات کے فیصلے کریں جو اس آئین کے مطابق ہوں۔ (7:159)

(۶) امت کی مجلس مشاورت (پارلیمان) اس آئین کے اصولوں کو عملی شکل دینے کے لئے جزئی قوانین مرتب کرنے کی مجاز ہوگی۔ لیکن ان قوانین کے اعلان سے پہلے ہی سرزدشدہ کسی جرم پر ان کا اطلاق نہیں ہوگا۔((5:95

یہ ہیں مختصر الفاظ میں اسلامی نظام کے دستور کے اساسی اصول۔ جو شخص اس نظام کے دائرے میں داخل ہونا چاہے گا' اسے یہ آئین دکھا دیا جائے گا۔ اگر وہ اسے اپنے لئے قابل قبول سمجھے گا تو اس نظام کے تابع آ جائے گا۔ اگر ایسا نہیں سمجھے گا تو وہ اس کے حدود سے باہر رہے گا۔ آپ سوچئے کہ جو شخص اس طرح اس دستور کو قبول کرے گا اسے کس قدر محکم ضمانت حاصل ہو جائے گی کہ اگر میں نے اس آئین کی خلاف ورزی نہ کی تو کوئی بڑی سے بڑی قوت بھی میری طرف آنکھ اٹھا کر نہیں دیکھ سکے گی' نہ ہی اسے اس قسم کا خدشہ ہوگا کہ نہ معلوم کل کو اس دستور میں کیا کیا تبدیلیاں کر دی جائیں۔ اس لئے کہ یہ ہمیشہ کے لئے غیر متبدل رہے گا۔

غور کیجئے کہ اس آئین کے تابع آ جانے والوں کی زندگی کس قدر خوف اور حزن سے مامون ہو جائے گی۔۔ اور انہیں کس قدر قلبی اطمینان اور ذہنی سکون حاصل ہوگا۔ آپ نے غور فرمایا کہ قرآنی نظام اور فکر انسانی کے وضع کردہ نظاموں میں کیا فرق ہے۔ کیا فکر انسانی کا وضع کردہ کوئی نظام اس کا مقابلہ کر سکتا ہے۔ کسی قوم کی اس سے بڑی حرماں نصیبی اور بدبختی کیا ہوگی کہ وہ اس قسم کا آئین اپنے ہاں رکھتے ہوئے انسانوں کے وضع کردہ دساتیر کو اپنے لئے ضابطۂ حیات بنائے اور اسی سے آپ اس کا بھی اندازہ لگا لیجئے کہ جو لوگ مغربی جمہوریت کو عین اسلام قرار دیتے ہیں وہ کس قدر فریب میں رہتے یا دوسروں کو فریب دیتے ہیں۔ مسلمانوں کی سیاست' جمہوریت نہیں' قرآنی دستور ہے۔ آج ہم ستاونواں یومِ آزادی منانے جا رہے ہیں لیکن اس حقیقت کو مُلا سمجھنے کے لئے تیار ہے نہ مسٹر۔

☆☆☆☆☆☆☆☆

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

علامہ غلام احمد پرویزؒ

بیوروکریسی

یہ لفظ اور اس کا (غلط العوام ترجمہ) ''نوکرشاہی'' آپ نے سینکڑوں بار پڑھا اور سنا ہوگا لیکن اس کے مفہوم یا مطلوب پر کم غور کیا ہوگا۔

آپ نے دیکھا ہوگا کہ جب کوئی نئی مشین باہر سے آتی ہے تو اس کے ساتھ ایک پمفلٹ ہوتا ہے جس میں اس مشین کے کل پرزوں کی تفصیل درج ہوتی ہے اور یہ بتایا گیا ہوتا ہے کہ مشین میں فلاں نقص پیدا ہو جائے تو کیا کرنا چاہئے۔ اس مشین کا آپریٹر اس مشین کو چلاتا رہتا ہے اور اگر اس میں کوئی نقص پیدا ہو جائے تو جھٹ سے پمفلٹ کھول کر متعلقہ ہدایات کا مطالعہ کرتا اور ان کے مطابق مشین کی اصلاح کر دیتا ہے۔ اس سارے عمل میں ایک بات قابل غور ہے اور وہ یہ کہ ایسا کرتے وقت اس کا صرف دماغ کام کرتا ہے۔ اس کے دل کا اس سے کچھ واسطہ نہیں ہوتا۔ دل کا واسطہ انسانوں سے ہوتا ہے' مشینوں سے نہیں۔

مغرب کی مادہ پرستی (Materialism) سے جب تصور حیات میں تبدیلی آئی تو اس کی رو سے انسانوں کو بھی مشینیں تصور کر لیا گیا۔ اسے کہتے ہی (Mechanical Concept of Life) ہیں۔ اس سے انسانوں کے (Human Beings) ہونے کا تصور ختم ہو گیا اور ان کے معاملات کا حل اسی طریق سے سوچا جانے لگا جس طریق سے کسی مشین کا نقص دور کیا جاتا ہے۔ اس طریق کی رو سے انہوں نے حکومتی نظم و نسق کے لئے بھی کچھ قواعد و ضوابط منضبط کئے اور ان کے پمفلٹ متعلقہ شعبوں میں بانٹ دیئے۔ منتظمہ کے کارپردازوں کو ان قواعد و ضوابط کی تعلیم دی گئی اور انہیں سمجھا دیا گیا کہ جو مسئلہ (Case) ان کے سامنے آئے اس کے متعلق دیکھ لیا جائے کہ' اس پمفلٹ میں کیا لکھا ہے۔ اس کے مطابق اس معاملہ کا تصفیہ کر دیا جائے اور ایسا کرنے میں کسی انسانی تقاضا کو دخل انداز نہ ہونے دیا جائے۔ ان انسانوں کو مشین سمجھا جائے اور اپنے آپ کو مشین کا آپریٹر۔ اس نظام حکومت کو بیوروکریسی کہا جاتا ہے۔ یعنی ''میزوں کی حکومت'' (اس لفظ کے بنیادی معنی یہی ہیں)۔ فائلوں کی حکومت۔ کاغذوں کی حکومت۔ اس نظام حکومت میں سب سے زیادہ قابل۔ دیانت دار۔ ذمہ دار۔ معتمد علیہ افسر' اسے سمجھا جاتا ہے جو متعلقہ افراد کو انسان سمجھے بغیر' انکے معاملات کا متعلقہ قواعد و ضوابط کے مطابق فیصلہ کر دے۔ اگر وہ ایسا کرتا ہے تو اسے بھی اس کا اطمینان ہو جاتا ہے کہ اس نے اپنے فرائض کو پوری ذمہ داری کے ساتھ ادا کر دیا' اور افسران بالا بھی اس کی فرض شناسی کی تعریف کرتے ہیں۔ ان میں سے کسی کو اس سے واسطہ نہیں ہوتا کہ اس سے انسانیت پر کیا بیتی؟ یہ گوشہ ان کی ذمہ

داری کے احاطہ ہی میں نہیں ہوتا۔

بیوروکریٹ اس نظام کو اس لئے گلے سے لگائے رکھتے ہیں کہ اس میں انہیں نہ معاملات کے فیصلہ میں چنداں کاوش کرنی پڑتی ہے، نہ اس کے عواقب کی کوئی ذمہ داری ان پر عائد ہوتی ہے۔ جب وہ متنازعہ امور کا فیصلہ متعلقہ قواعد وضوابط کی رو سے (میکانکی طور پر) کر دیتے ہیں تو اپنی ذمہ داری سے سبکدوش ہو جاتے ہیں۔ یہ خلش انہیں ستاتی ہی نہیں کہ اس سے ''انسانیت'' پر کیا گذری ہے؟

دریا کو اپنی موج کی طغیانیوں سے کام
کشتی کسی کی پار لگے، یا درمیاں رہے

آج ہمارا معاشرہ جس اضطراب پیہم کی آماجگاہ بن رہا ہے اس کی وجہ یہ ہے کہ جہاں انسانی معاملات کا فیصلہ قواعد وضوابط کے مطابق، دیانتدارانہ طور پر کیا جاتا ہے، وہاں انسانی تقاضوں (Human-consideration) کا کوئی خیال نہیں رکھا جاتا..... وہاں ترجیح ''فارمز کے پر کرنے'' کو دی جاتی ہے، انسانی زندگی کو نہیں اور جہاں ان ضوابط میں لچک پیدا کی جاتی ہے تو اس کا جذبۂ محرکہ ذاتی مفادات (رشوت ستانی اور بدعنوانی) ہوتا ہے۔ نتیجہ دونوں کا کرب واضطراب اور عدم سکون واطمینان ہوتا ہے۔

☆☆☆

ان لوگوں کی یہ ذہنیت اور یہ انداز عمل، ان کی سرکاری زندگی تک ہی محدود نہیں رہتا۔ رفتہ رفتہ یہ ان کی فطرت ثانیہ بن جاتا ہے۔ معاشرتی زندگی کا کوئی گوشہ ہو، ان کے تعلقات اور روابط یکسر مشینی بن کر رہ جاتے ہیں۔ ان میں انسانی حسیّات کی رعایت یا جذبات کی لطافت کا کوئی دخل نہیں ہوتا۔ حتیٰ کہ ان کے گھر کی زندگی بھی ''بابو آنہ'' بن کر رہ جاتی ہے۔ آپ نے کھانے پینے کی بعض درآمدی چیزوں پر لکھا دیکھا ہوگا:

(Un-Touched by Hand During Manufacture)

ان کے بنانے میں ہاتھ کو نہیں چھونے دیا گیا۔

ان حضرات کی زندگی بھی کچھ ایسی ہی ہو جاتی ہے۔ یہ بالکل (Robots) مشینی انسان بن کر رہ جاتے ہیں۔(اے) جب خود اپنے بال بچوں کے ساتھ ان کا رویہ اس قسم کا مشینی ہو، تو دوسرے انسانوں کے ساتھ ان کے برتاؤ میں لوچ کیسے آسکے گی۔ اقبالؔ نے کہا تھا کہ ؎

بملازمان سلطاں خبرے دہم زرازے
کہ جہاں تواں گرفتن بنوائے دلگدازے

''نوائے دل گداز'' سے یہ آشنا ہی نہیں ہوتے۔ یہی وجہ ہے کہ ''جہاں گیری'' تو ایک طرف، جب یہ کرسی چھوڑ کر ریٹائر ہوتے ہیں تو انہیں معاشرہ میں ایک بھی ہمنوا نہیں ملتا۔ یہ ''یوسفِ بے کارواں'' کی طرح اکیلے پھرتے رہتے ہیں۔

انہیں وقت گزارنے کے لئے کوئی ٹھکانہ نہیں ملتا۔ قفس کے خوگر پرندے کی طرح اٹھتے ہیں تو دفتروں کا رخ کر لیتے ہیں لیکن وہاں کی فضا ایسی بدلی ہوئی پاتے ہیں کہ پہلے برآمدے میں ان کے پاؤں کی آہٹ پا کر بابو لوگ کمرے کے اندر اپنی نشستوں سے اٹھ کر کھڑے ہو جاتے تھے اور اب کیفیت یہ ہوتی ہے کہ کمروں کے اندر جاتے ہیں تو کوئی کرسی تک کی پیش کش نہیں کرتا۔ یونہی جھوٹی ہنسی کے ساتھ کبھی اس کے پاس کبھی اس کے پاس کھڑے ہو کر واپس آجاتے ہیں۔ میر تقیؔ نے غالباً انہی کے متعلق کہا تھا کہ ؎

ترے کوچے ہر بہانے یوں ہی دن سے رات کرنا
کبھی اس سے بات کرنا کبھی اس سے بات کرنا!

اس سے کہیں زیادہ عبرت انگیز اور قابل رحم ان کی ایک اور حالت

(اے) ان میں مستثنیات بھی ہوتے ہیں جو اس جہانِ سنگ وخشت میں ذوقِ لطیف اور حسیّات انسانی کو برقرار رکھتے ہیں لیکن ایسا کرنے میں انہیں کس قدر مشقت اٹھانی پڑتی ہے اس کا اندازہ باہر کا آدمی کم لگا سکتا ہے۔

ہوتی ہے۔ ریٹائر ہوتے ہیں تو ''فتوحاتِ بالائی'' کا سلسلہ بھی ختم ہو جاتا ہے اور جو پنشن ملتی ہے' وہ تنخواہ کے نصف سے بھی کم ہوتی ہے' لیکن پنشن اسی دن نہیں مل جاتی اسے منظور کرانے کے لئے دنوں مہینوں سالوں تک دفتروں کے چکر لگانے پڑتے ہیں اور وہاں کے مشینی انسان ان کی حالتِ زار پر کبھی ترس نہیں کھاتے۔ بعض تو انہیں چکروں کے راستے عدم آباد تک پہنچ جاتے ہیں۔ یہ ہر ایک سے شکایت ہی نہیں فریاد کرتے ہیں کہ پنشن سے متعلق دفاتر کی کرسیوں پر بیٹھے ہوئے انسان نہیں پتھر کے بت ہیں جنہیں اس کا قطعاً خیال نہیں آتا کہ مجھ پر اور میرے بال بچوں پر کیا گزر رہی ہے۔

ایسا کہتے وقت انہیں قطعاً یاد نہیں رہتا کہ کل تک وہ بھی انہیں کرسیوں پر پتھر بن کر بیٹھے رہتے تھے اور انہیں بھی کسی کے حال زار پر ترس نہیں آتا تھا۔ وہ ہر غرض مند کو یہ کہہ کر دھتکار دیتے تھے کہ میں قواعد وضوابط کے ہاتھوں مجبور ہوں۔

مذہب میں مشینی عمل

مذہب کی دنیا میں پہنچ کر یہ رسوم پرستی اور ہی گل کھلاتی ہے۔ الدین زندگی کے حدود متعین کرتا ہے جن کے اندر رہتے ہوئے فرد کو فکر وعمل کی آزادی ہوتی ہے۔ اس کے لئے اسے اپنے لئے آپ فیصلہ کرنا اور اس فیصلے کی ذمہ داری قبول کرنا ہوتا ہے۔ اسے دیکھنا یہ ہوتا ہے کہ وہ فیصلہ ان مقاصد کی سمت ایک قدم ہے جسے الدین نے متعین کیا ہے۔ اور وہ مقصد ہے۔ ما ینفع الناس... (13:17) ''جو نوعِ انسان کے لئے منفعت بخش ہو''۔ اس سے اس فرد کی ذات میں بھی انسانی صلاحیتوں کی نشوونما ہوتی ہے' اور اس کے معاشرہ میں بھی نکھار پیدا ہوتا ہے۔ لیکن مذہب میں اس کی آزادی اور خود فیصلہ لینے کی صلاحیت کو کچل کر رکھ دیا جاتا ہے۔ آپ فقہ کی کسی کتاب کو اٹھا کر دیکھئے۔ اس میں انسان کے ایک ایک قدم کے لئے متعین ''شرعی احکام'' منضبط ملیں گے۔ بیٹھو اس طرح۔ اٹھو اس طرح۔ چلو اس طرح۔ سوؤ اس طرح۔ کھاؤ اس طرح۔ پیو اس طرح۔ غسل اس طرح کرو۔ بیت الخلاء میں یوں جاؤ۔ حتیٰ کہ اس میں میاں بیوی کے جنسی اختلاط کے لئے بھی قواعد و ضوابط ہوں گے۔ ان قواعد وضوابط کی پابندی میکانکی طور پر کی جائے گی کیونکہ ان سے مقصد' ان کی پابندی کے سوا کچھ نہیں ہوتا۔ نتیجہ یہ کہ جو شخص جتنا زیادہ ان احکام کا پابند ہوگا وہ اتنا ہی زیادہ عبوساً قمطریراً... قسم کی چوبِ خشک بن جائے گا جس میں انسانی زندگی کی لوچ اور لچک کا شائبہ تک نہیں ہوگا۔ دہلی میں ایک بہت بڑے مفتی صاحب تھے۔ ان کی بدنصیب بیوی اکثر بیمار رہتی تھی۔ وہ ایک دن اس سے کہہ رہے تھے کہ نکاح نامہ کی رو سے تمہارا نان و نفقہ تو میرے ذمے ہے' علاج معالجہ نہیں۔ اس کے لئے تمہیں اپنے ماں باپ سے کہنا ہوگا۔ اس قسم کی بن جاتی ہے ''فطرت'' ان لوگوں کی جو احکامِ شریعت کی پابندی اس طرح کرتے ہیں۔ پھر چونکہ یہ اپنے آپ کو بے حد متقی اور پرہیز گار سمجھتے ہیں۔ اس لئے ان میں بے حد تکبر اور نخوت پیدا ہو جاتا ہے۔ وہ ساری دنیا سے خفا رہتے اور دوسروں کو نفرت کی نگاہ سے دیکھتے ہیں' کیونکہ وہ ان کی نگاہ میں فاسق و فاجر' جہنم کے کندے ہوتے ہیں۔ اس سے وہ عجیب قسم کی مخلوق بن جاتے ہیں جن میں نہ زندگی کی لطافت ہوتی ہے' نہ انسانیت کی لچک۔ بیوروکریٹک کی طرح ان کی بھی اپنی الگ برادری ہوتی ہے۔ جس طرح ان کے ہاں (D.F.A) اور (P.U.C) کے سوا کوئی موضوع گفتگو نہیں ہوتا' ان کے ہاں بھی ساری زندگی ''مکروہ اور مباح'' کی بحثوں میں سمٹ اور سمٹا کر رہ جاتی ہے۔ اور ان کے فتوؤں میں انسانی زندگی کہیں بار نہیں پاتی۔ یہ انسان نہیں' قرآن کے الفاظ میں ''خشب مسندہ'' بن کر رہ جاتے ہیں۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

(محترم مولانا قاری محمد طیب صاحب)

القرآن العظیم

(آج سے کچھ عرصہ پہلے تک آپ نے دیکھا ہوگا کہ ہمارے دینی مکاتب و مدارس اور مساجد و منابر سے ہمیشہ فقہ اور احادیث، قصص و آثار اور تاریخ و سیر کے چرچے ہوتے رہتے تھے اور قرآن کا نام اس طرح تبرکاً لے لیا جاتا تھا جس طرح خطوط کے اوپر ۷۸۶ (غیر شعوری طور پر) تبرکاً لکھ لیا جاتا ہے۔ طلوع اسلام نے ۱۹۳۸ء میں قرآن کی دائمی مکمل اور غیر متبدل تعلیم کی آواز بلند کی اور بتوفیقِ ایزدی وہ دن بدن آگے بڑھتی چلی گئی۔ حتیٰ کہ آج اس کے اثر کا یہ عالم ہے کہ خود ان گوشوں سے بھی جن کا ذکر اوپر کیا گیا ہے قرآن کی محکمیت اور اکملیت کے اعلانات ہونے شروع ہو گئے ہیں۔ الحمدللہ علیٰ ذلک۔ اس کی ایک شہادت زیر نظر مضمون بہم پہنچاتا ہے۔ صاحب مضمون قاری محمد طیب صاحب صدر مہتمم مدرسہ عالیہ دارالعلوم دیوبند تھے۔ جہاں کے فارغ التحصیل طلباء کو قرآن کا جتنا علم ہوتا ہے وہ کسی سے پوشیدہ نہیں۔ یہ کتنا بڑا انقلاب ہے کہ اس دیوبند کے مہتمم صاحب کی طرف سے اس کے ماہنامہ ''دارالعلوم'' میں قرآن کی عظمت کا اس طرح اعتراف کیا جائے۔ ہم قابل مبارکباد سمجھتے ہیں دیوبند کے مجلہ ''دارالعلوم'' کو جس کے شکریہ کے ساتھ طلوع اسلام اپنی روش کے خلاف اس مضمون کو نقل کرتا ہے۔ خدا کرے کہ پاکستان کے کسی مکتب یا مسجد سے بھی قرآن کی آواز بلند ہونا شروع ہو جائے۔) [طلوع اسلام]

قوموں اور ملتوں کی تعمیر یادگاروں اور مجسموں سے نہیں ہوتی بلکہ لٹریچر اور مدون شدہ علمی ذخیروں سے ہوتی ہے۔ لٹریچر میں اس قوم کے مخصوص ذہنی جذبات کی محرک تعبیریں مرقوم ہوتی ہیں اور جوں ہی دماغ ان لکیروں سے گذرتا ہے ووں ہی اس میں متعلقہ جذبات بیدار ہو کر قوائے عمل کو برانگیختہ کر دیتے ہیں اور قوم کے فکر و عمل کا ایک مخصوص خاکہ تیار ہو جاتا ہے جس سے یہ قوم اپنا وجود پا لیتی ہے۔ اور اقوام کے جمگھٹے میں اپنے انہی مخصوص افکار و اعمال کے ذریعے ایک امتیازی وجود کے ساتھ موجود ہو جاتی ہے۔ مثلاً

ہندو قوم کا ایک خاص کلچر اور خاص رنگ کی ایک تہذیب ہے، لیکن یہ تہذیب ان کی تعمیری یادگاروں اور مجسموں جیسے اشوک کی لاٹ، اِلُوراء کے غار، ایجنٹا کی مورتیوں اور سومنات کے مندر وغیرہ سے نہیں بنی، کہ ہندو قوم کا بننا اور بگڑنا ان چیزوں کے ہونے نہ ہونے پر موقوف نہیں۔ اس قوم کو جو چیز سنبھالے ہوئے ہے وہ مہابھارت، گیتا اور شاستر، پُران وغیرہ کا لٹریچر ہے جو انکی تہذیب و ثقافت کی تعبیر ہے اور

ان کے دماغوں اور قومی جذبات کو تھامے کھڑی ہے۔

عرب قومیں ایران و فارس میں پہنچیں' اسے فتح کیا' وہاں کی قوموں کو فتح کیا' ان کے تہذیب و تمدن پر گہرا اثر ڈالا۔ بظاہر مفتوح قوم کو اس انقلاب کے بعد مٹ جانا چاہئے تھا لیکن جس چیز نے مفتوح قوم کو مٹنے سے بچا لیا' بلکہ فاتح کے دل میں مفتوح کا گھر بنا دیا وہ شاہنامہ وغیرہ کا فارسی لٹریچر ہے۔ فردوسی نے اپنی قوم پر احسان کیا' اور ایرانیوں کی عظمتِ رفتہ کو موت کے منہ سے نکال لیا' نہ صرف یہی بلکہ مسلمانوں کو اس حد تک اس عظمت کا دلدادہ بنا دیا کہ سلاطین اسلام اور امراء عوام نے فخر کے ساتھ ان کارناموں کو اپنی تاریخ میں جگہ دی وراس حد تک متاثر ہوئے کہ ان کے ناموں سے تسمیہ تک مسلمانوں میں رائج ہو گیا۔ رستم خاں' سہراب خاں' جمشید علی' امیر خسرو' فیروز بخت' جواں بخت' فرخ سیر وغیرہ اسماء نے وقعت کے ساتھ لٹریچر میں جگہ پا لی۔ یہی وہ لٹریچر تھا جس نے نہ صرف مفتوح کو بچایا بلکہ فاتح کو مفتوح کیا۔

عربوں کی شجاعت اور قومی روایات انتہائی جہالت اور فقدان تعلیم کے باوجود ان کے شاعروں اور خطیبوں نے قائم رکھیں' اس دور میں خطابت و شاعری میں ان کا لٹریچر اور فکری ذخیرہ پنہاں تھا جس کی تعبیروں میں ان کا تمدن اور کلچر لپٹا ہوا تھا' وہ شاعر بنتے نہ تھے بلکہ پیدا ہوتے تھے اور مفاخر عرب پر قصائد اور کہاوتیں کہہ کر قوم کی روایات تھامے ہوئے تھے۔

ماضی قریب میں گاندھی اور دوسرے لیڈروں کا یہی فکری ذخیرہ تھا جس نے اولاً خیالات کی دنیا میں انقلاب و ہیجان بپا کیا' پھر قول و عمل میں اس کی جلوہ گری ہوئی اور پھر آخر کار ملک میں انقلاب رونما ہو گیا' جو درحقیقت وہی فکری اور ذہنی انقلاب تھا جس نے اندر سے باہر آتے ہوئے مختلف روپ اختیار کئے اور بال آخر ملک کی غلامی کو آزادی سے بدل دیا جس سے واضح ہو گیا کہ قومیتوں کا مدار کاران کا لٹریچر ٹھہر جاتا ہے۔ غرض لٹریچر ہی خیالات کی دنیا بناتا ہے اور پھر وہی عملی دنیا میں متمثل ہو کر جلوہ گر ہو جاتا ہے' گویا قوم کے اوپر بظاہر لباس اون' ریشم اور زری کا ہوتا ہے لیکن اس کے پردہ میں قوم اپنے لٹریچر کے لباس سے ملبوس ہوتی ہے جو لباس اور ملبوس دونوں میں رچا ہوا ہوتا ہے اور برنگ لباس خود ہی ظہور کرتا ہے اور قومیتوں کی تعمیر و تخریب کا معیار لٹریچر ثابت ہوتا ہے نہ کہ یادگاریں' محسوس یادگاروں سے مٹی ہوئی کسی قوم کی یاد تو زندہ رہتی ہے لیکن خود قوم زندہ نہیں ہوتی' آج متعدد قوموں کی یادگاریں مجسموں اور عمارتوں کی شکل میں موجود ہیں لیکن خود وہ قومیں موجود نہیں کیونکہ ان کے بقا کا ضامن لٹریچر موجود نہیں جس سے اس قوم میں حرکت اور زندگی پیدا ہوتی ہے' لیکن اگر کسی قوم کی حسی یادگاریں منہدم ہو جائیں مگر معنوی ذخیرے محفوظ طریقہ پر ان کے کردار و گفتار سے بروئے کار آئے ہوں تو اس قوم کے مٹ جانے کا کوئی تصور نہیں باندھا جا سکتا۔

بہرحال قوموں کی حیات و ممات کا واحد معیار ان کا لٹریچر اور فکری و عملی سرمایہ ہے جو قوم کے لئے بمنزلۂ روح و حیات کے ہوتا ہے۔

لٹریچر کے ساتھ لٹریچر فراہم کرنے والی شخصیتوں

سے بھی قطع نظر نہیں کی جا سکتی۔ اگر لٹریچر جمع کرنے والے اچھے خیالات و جذبات کے حامل اور خود اس لٹریچر سے متاثر ہیں تو قلوب کی دنیا سنور کر بیرونی دنیا کو درست کرتی ہے ورنہ بگاڑ دیتی ہے' آج کے ہنگاموں' غارت گریوں اور آبروریزیوں کا الزام لوگ غنڈوں پر رکھتے ہیں لیکن سوال یہ ہے کہ ان غنڈوں کو کس نے بنایا؟ اور ان کے ظالمانہ اور سفاکانہ افکار کی تعمیر کس نے کی؟۔۔۔ یہ انہی کی نیکی اور بدی تھی جس کا لباس غنڈوں اور دوسروں نے پہن کر اس نیکی و بدی کو قلم سے زبان تک اور زبان سے ہاتھ پیر تک پہنچایا اور دنیا کو بدل دیا' بلاشبہ دنیا میں انقلاب پروپیگنڈا کرتا ہے مگر پروپیگنڈے کو زندہ لٹریچر کرتا ہے' جس کی آلۂ کار قوم بنتی ہے اور انفس کا ذہنی انقلاب آفاق میں خارجی انقلاب لے آتا ہے۔ ان اللّٰہ لا یغیر ما بقوم حتی یغیروا ما بانفسھم۔

مسلمانوں کی قومی زندگی اور ان کی اجتماعی تشکیل و تنظیم اور ان کی عالمگیر ترقی بھی ان کے لٹریچر کا ثمرہ ہے' مسلمانوں نے عرب' ایران' روم و شام' مصر و فلسطین' عراق و خراسان' ترکستان' افغانستان' ہندوستان' جزائر شرق الہند اور ایشیا و یورپ کا بڑا حصہ فتح کیا' غیر مفتوحہ علاقوں پر اپنا اثر قائم کیا' عالم پر اپنا پرچم لہرایا اور مختلف روحی تہذیبوں اور تمدنوں کے سمندروں میں بھونچال ڈال دیئے لیکن یہ ان کی طوفانی ترقی' تعمیرات' مجسموں' یادگاروں' تصویروں اور مورتیوں کی رہین منت نہیں' کہ ان رسمیات کو تو اسنے خود ہی جڑ سے اکھاڑ کر پھینک دیا تھا' بلکہ یہ سب کچھ ان کے اس فطرت نواز لٹریچر کا ثمرہ تھا جس نے ان کے دل و دماغ کی تعمیر کی' ان کے نظر و فکر کو وسیع اور عالمگیر بنایا' ان کے قواء علم و عمل کو بیدار کر کے انہیں عمل کا ایک لامحدود میدان بخشا' اور ایک نصب العین پیش کر کے ان کی ہمہ گیر تنظیم کر دی' اس لٹریچر کا نام ''القرآن الحکیم'' ہے' اس لئے قرآن میں قرآن کو ''روح حیات'' کہا گیا ہے:

وکذٰلک اوحینا الیک روحا من امرنا۔

اور حدیث نبوی میں قرآن کو اقوام کی ترقی و تنزل کا واحد معیار بتلایا گیا ہے:

برفع بھذا الکتاب اقواما ویضع بہ اٰخرین۔

قرن اول کے جلیل القدر مسلمانوں کے پاس لٹریچر کے سلسلہ میں ''قرآن عظیم'' کے سوا دوسری کتاب نہ تھی' اگر تھی تو اس کی اولین شرح و تفسیر تھی' جس کو حدیث کہا جاتا ہے اور اگر اس کے بعد کچھ اور تھا تو وہ انہی دونوں مصدر شریعت سے نکلا ہوا مسائل کا ذخیرہ تھا جس کو فقہ کہا جاتا ہے لیکن ان سب کی اصل اصول یہی کتاب (ا۔) مبین تھی جس کے عالمگیر اصول نے اس قوم کے اخلاق' اعتقاد' اعمال اور افکار و جذبات میں بھی عالمگیری پیدا کی' یہاں تک کہ اسی قوم اور اس کے لٹریچر کی بدولت پوری دنیا میں شعوری اور غیر شعوری طور پر عالمی مقاصد کا تخیل پھیل گیا' اس لئے قرآن حکیم میں اس قرآن کو پوری دنیا اور اس کے سارے جہانوں کے لئے پیغام ہدایت و موعظت بتلایا گیا ہے۔ ان ھوا لا ذکری للعٰلمین جس سے واضح ہے کہ اس کے فطری اور کلی اصول نہ صرف مسلمانوں بلکہ ساری دنیا والوں کے لئے اصول ترقی ہیں۔ دارین کے لئے اختیار کئے جائیں تو دارین کی نجات و فلاح ہے اور صرف

(ا۔) اس لئے اس اصل الاصول پر متفرع جزئیات زمانے کے تقاضوں کے ساتھ بدلتی رہیں گی اور یہ اصل الاصول ہمیشہ تک غیر متبدل رہے گی تا کہ اس میں سے ہر دور میں نئی نئی شاخیں پھوٹتی رہیں اور اپنا پھل دیتی رہیں۔ (طلوع اسلام)

دار دنیا کے لئے استعمال کئے جائیں تو دنیا کی بہبود و ترقی ہے' غلط فہمی یا لاعلمی سے یہ سمجھ لیا گیا ہے کہ اس قرآنی لٹریچر کے مسائل حیات اور شئون زندگی کسی اگلے یا پچھلے دور کے ساتھ مخصوص ہیں' اور کم از کم آج کے ترقی یافتہ دور میں ان کے لئے کوئی گنجائش نہیں اور اس لئے کہا جاتا ہے کہ مذہب کو سیاسی اور معاشرتی میدان سے رخصت دے دی جائے اور اس کی جگہ مناسبِ وقت لادینی تصور اور فکر پیدا کیا جائے کہ اس کے بغیر عالمی نظم اور عالمی سیاست و ادارت قائم نہیں ہوسکتی اور اس دور میں عالمی حکومت قائم ہونا قومی خودکشی کے مرادف ہے' لیکن یہ عجب ستم ظریفی ہے کہ عالمی زندگی' عالمی سیاست اور بین الاقوامی ادارت و نظم کے نام پر جب اس کے اجزاء ترکیبی یا اسباب و موانع کو گنایا جاتا ہے تو وہ سب کے سب وہی ہوتے ہیں جن کی طرف سب سے پہلے اسلام ہی نے توجہ دلائی اور اس نے اس نقشہ پر عالمی نظام کا اعلان کیا' مثلاً موانع کے سلسلے میں کہا جاتا ہے کہ جب تک نسلی امتیازات' اقتصادی اونچ نیچ' سیاسی برتری اور کہتری' آقائی اور غلامی کا فرق' قومیتوں اور وطنیتوں کی تعصب آمیز حد بندیاں' قومی طبقات کا عدم توازن' رابطۂ عوام کی درمیانی رکاوٹیں ختم نہ کردی جائیں گی عالمی نظام قائم نہیں ہوسکتا۔

سوال یہ ہے کہ ان موانع کو آپ کے سامنے پیش کس نے کیا؟ اگر اسلام نے اور بلاشبہ اس نے اور صرف اسی نے تو پھر یہ کہنا کہ آج کے ترقی یافتہ دور میں اس کا پیش کردہ فکر کارآمد نہیں' کیا خود اپنے ہی منہ پر طمانچہ مارنا نہیں ہے؟ یا اسی طرح جب عالمی نظام کے اسباب و معدات گناتے ہوئے کہا جاتا ہے کہ اخوۃ عامہ' ہمہ گیر مساوات' نسلی اکتائی اور پوری دنیا کا ایک عالمی کریڈ اور مسلک سامنے نہ لایا جائے گا اس وقت تک معاش کا عمومی توازن' بین الاقوامی شوریٰ' قوانین بین الملل' عالمی حکومت قائم نہیں ہوسکتی۔

سوال یہ ہے کہ ان اجزاء کا شعور آپ میں کہاں سے آیا؟ اگر اسلامی لٹریچر سے آیا ہے اور بلاشبہ صرف اسی سے آیا ہے کیونکہ اس سے پہلے بین الاقوامیت کا نعرہ لگا کر کسی ملت نے بھی کوئی مکمل بین الاقوامی پروگرام پیش نہیں کیا' جس میں تمام شعبہ ہائے زندگی کی رعایت ہو تو پھر یہ کہنا کہ یہ لٹریچر آج کے دور میں کافی نہیں' خود اپنے ہی کو جھٹلانا نہیں تو اور کیا ہے؟ اور اس کا مطلب اس کے سوا اور کیا نکلتا ہے کہ دنیا اس قانون کے عالمگیر اجزاء کو تو ماننا چاہتی ہے' مگر اس کی طرف منسوب کرکے ماننا نہیں چاہتی' گویا مانگ کر لینا نہیں چاہتی' چرا کر اڑانا چاہتی ہے' یا بالفاظ دیگر خدائی قانون اور مذہب کا نام رکھ کر تسلیم کرنا نہیں چاہتی' بلکہ اپنا مفروضہ کہہ کر قبول کرنا چاہتی ہے' یہ انداز تسلیم اچھا ہو یا برا۔ مگر اس سے یہ بات صاف ہوجاتی ہے کہ آج کی دنیا زندگی کی جدوجہد اور شئونِ حیات میں ان اسلامی اصول سے کسی طرح بھی مستغنی نہیں ہے اور وہ طوعاً یا کرہاً ان کی طرف جھکنے کے سوا چارۂ کار نہیں دیکھتی۔

غور کیا جائے آج جبکہ سنجیدہ اور فکرمند غیر مسلم بھی اسلام کے معاشی اور سیاسی نظام کو اسے کسی خاص دور یا خاص فرقہ کے لئے مخصوص نہیں سمجھتے تو مسلم کے لئے اس کی کیا گنجائش نکل سکتی ہے کہ وہ اسے کسی دور کے ساتھ مخصوص سمجھنے کی جرأت

کرے' نیز جبکہ عامتہً اقوامِ دنیا کی بین الاقوامی زندگی ہی ان شئونِ حیات کے بغیر زندگی نہیں بنتی' گویا کسی قوم کو بھی اس بارہ میں مسلم بنے بغیر چارہ نہیں ہوتا' گو وہ بلا اعلان اور بلا عنوان کے ہی مسلم بنے تو خود مسلم قوم کی زندگی اس دستور حیات کے بغیر کیسے بن سکتی ہے اور کس طرح زندگی کہلائی جا سکے گی؟ مسلم قوم حسی یادگاروں سے زندہ نہیں رہ سکتی بلکہ اپنی انہی لٹریچری یادگاروں اور شئونِ معنوی ہی سے برقرار رہ سکتی ہے۔ اس کی زندگی تاج محل آگرہ' لال قلعہ دہلی' قلعہ معلّٰی لاہور' قطب کی لاٹ' چار مینار دکن' الحمراء اندلس' قصر عابدین مصر' سعودی محل جدہ' یا افغانستان و ایران اور روم و شام کی عالیشان عمارتوں یا تصویروں سے نہیں' کہ یہ بننے اور بگڑنے والی چیزیں ہیں' ان پر نہ اس قوم کی ماضی کی تعمیر ہوئی نہ مستقبل کی ہو سکتی ہے بلکہ یہ قوم اپنے اسی آسمانی لٹریچر' اپنی قومی روایات' اپنے اخلاق و روحانیات اور اپنی ہی روایتی شئونِ حیات سے بنی ہے اور انہی سے باقی رہے گی۔ اس قوم کا کام نہ نقالی سے چل سکتا ہے نہ مرعوبیت سے بلکہ دلیری کے ساتھ اپنی ہی بنیادوں پر اپنی تعمیر کرنے سے چل سکتا ہے' دوسروں کی بنیادوں پر اپنی تعمیر اٹھانے سے تعمیر اپنی نہیں کہلائی جا سکتی' بنیاد والوں کو ہر وقت حق ہے کہ وہ ملبہ اٹھا لینے کا مطالبہ کریں۔ اس صورت میں دست نگر قوم کی نہ بنیاد باقی رہتی ہے نہ عمارت۔

کسی قوم کی تنظیم اعلانوں یا تنظیم کی تمناؤں کے اظہار سے نہیں ہوتی بلکہ فکر و خیال کی ہم آہنگی اور یکسانی سے ہوتی ہے' اس لئے ایک صحیح اور فطری نصب العین کو عملی طور پر لے کر کھڑے ہو جانے ہی سے قوم منظم ہو سکتی ہے اور اس کے لئے قرآن کی بتائی ہوئی عالمگیر بنیادوں سے بڑھ کر کوئی نصب العین نہیں ہو سکتا۔

۔۔۔۔(۱) اس کا عالمی نعرہ لا الٰہ الا اللہ ہے جو تمام انبیاء کا دین ہے' جس سے خود ساختہ اور محدود رنگ برنگ کے فرضی خداؤں' وطن' قوم' نسل' رنگ' مورت اور مجسمہ وغیرہ کی نفی ہو جاتی ہے اور حقیقی توحید سامنے آ جاتی ہے جس پر اقوام عالم جمع ہو سکتی ہے۔ تعالوا الی کلمتٍ سوائٍ بیننا و بینکم۔

۔۔۔۔(۲) اس کی عالمی سیاست کا اساسی مقام خلافت ہے۔ جس سے ملوکیت' شہنشاہی اور سیاسی آقائی و غلامی کا خاتمہ ہو جاتا ہے اور صحیح قسم کی جمہوریت اور اپنے ہمہ گیر اصول کے لحاظ سے پوری دنیا کی بین الاقوامیت قائم ہو جاتی ہے جس سے ٹکڑے ٹکڑے شدہ مملکتیں ایک کنٹرول میں آ سکتی ہیں۔

۔۔۔۔(۳) اس کا عالمی قانون ضابطۂ فطرت (کلام الٰہی) ہے جس سے قانون سازیوں کی تشویشات اور اس کے راستے سے آنے والی قومی خود غرضیوں کا خاتمہ ہو جاتا ہے اور باہمی آویزشوں سے تنگ آئی ہوئی پارٹیاں ایک نقطہ پر جمع ہو سکتی ہیں۔

۔۔۔۔(۴) اس کی عالمی اجتماعیت کا مظاہرہ بیت اللہ کے اردگرد جمع ہو کر اپنی عقیدت و محبت کا ثبوت دیتا ہے جس سے بین الاقوامی انتشار اور انفرادیتوں کا خاتمہ ہو جاتا ہے اور بکھرے افراد عالم ایک مرکز پر جمع ہو سکتے ہیں۔

۔۔۔۔(۵) اس کا عالمی مرکز کعبۂ محترم ہے جو نافِ عالم اور مرکزِ حیات و ہدایت ہے جس سے متضاد رخ باشندوں کی تضاد حسی ختم ہو کر رخ کی وحدت اور ہمہ گیری پیدا ہو جاتی ہے۔

۔۔۔۔(۶) اس کی عالمی عبادت نماز ہے، جس میں نہ گھی تیل کی ضرورت ہے نہ کسی اسم وصورت کے مواجہہ کی اور نہ کسی خاص عمارت کی۔ خدا کی ساری زمین اس کے لئے مسجد ہے اور زمین کی جنس کا ہر حصہ اس کے لئے پاک وطہور ہے، بحر و بر اور فضاؤ ہوا میں ہر جگہ رہ کر یہ عبادت ادا کی جاسکتی ہے اور جس کی جماعتی منظم صورت سے تشتت فکر اور شرک فی المقصود کا خاتمہ ہو کر دنیا کے تمام منطقوں کے افراد ایک رخ پر ہو سکتے ہیں۔

۔۔۔۔(۷) اس کی عالمی معاشرت کی روح اخوت و مساوات ہے جس سے بناوٹی امتیازات کا خاتمہ ہو کر ایک عالمگیر برادری، بھائی چارہ کی زندگی کی اساس و بنیاد پڑ جاتی ہے اور اخلاقی بین الاقوامیت پیدا ہو جاتی ہے۔

۔۔۔۔(۸) اس کی عالمی اخلاقیت کا جوہر احترامِ انسانیت ہے جس سے چھوت چھات اور ذات پات کی پراگندگیوں کا خاتمہ ہو جاتا ہے اور بلند و پست فرق مراتب کے ساتھ ایک سطح پر آ جاتے ہیں۔

بہرحال اصول مذکورہ سے دیانت، سیاست، معاشرت اور اخلاقیت وغیرہ سے تمام ایسی حد بندیوں کا خاتمہ ہو جاتا ہے جن کے رہتے ہوئے عالمی نظام قائم نہیں ہوسکتا تھا اور ایسے ہمہ گیر حسی اور معنوی نقطے فراہم ہو جاتے ہیں جن پر مذہبی اور غیر مذہبی قوتیں جمع ہو کر ایک قوم بن سکتی ہیں، پس اگر بین الاقومیت پسندوں کو مذہب سے اس لئے گریز ہے کہ عامۃً مذاہب کی حد بندیاں تمدن و تہذیب کی ہمہ گیری میں حارج ہیں، تو ان عالمگیر حدودِ مذہب کے بعد جو اسلام نے پیش کی ہیں یہ عذر باقی نہیں رہتا۔ اگر خدا سے بغاوت اور کنارہ کشی مقصود ہے تو اس عذرِ لنگ کا پردہ محض دھوکہ دہی ہو کر رہ جاتا ہے البتہ سنجیدہ دنیا کے نزدیک کبھی باوقعت اور درخور اعتنا نہیں ہوسکتا، تاہم آج جبکہ دنیا کی اکثریت طوعاً یا کرہاً خود ہی ان اصول کی طرف آ رہی ہے خواہ مذہب پسندی کے رنگ اور اعتقاد و عقیدت کے انداز سے نہ سہی، سیاسی اور تمدنی انداز ہی سے سہی تو کوئی وجہ نہیں ہے کہ متعصب اقوام کی خاطر انہیں دنیا کے سامنے پیش کرنے سے شرمایا جائے، یا اگر دنیا لادینی فکر سے بین الاقوامیت کی طرف بڑھ رہی ہے مگر انہی اصول کی مدد سے، تو کوئی وجہ نہیں ہے کہ دینی فکر سے اسے بین الاقوامیت کی دعوت دینے میں جھجک محسوس کی جائے جو ان اصول کا اصل منشاء اور مقصود ہے، بلکہ عام انسانیت کی بہی خواہی اور ہمدردی کا تقاضا ہے کہ دنیا کی بین الاقوامیت میں سے لادینی تصور کو خارج کرنے کی پوری سعی کی جائے کیونکہ اس سے لادینی تصور کی بین الاقوامیت قطع نظر اس سے کہ لادینی جمہوریت اسلام کے اور ہر مذہب کے منشاء کے سرتاسر خلاف ہے، تجربہ کے لحاظ سے یہی دنیا کے لئے مہلک اور مخرب ثابت ہو رہی ہے۔ چنانچہ جب سے یہ لادینی تصور کی بین الاقوامیت نمودار ہوئی ہے، جب ہی سے دنیا کی بین الاقوامی تخریب و ہلاکت بھی روز بروز قریب ہوتی جا رہی ہے، عالم سے عالمی امن وسکون رخصت ہو چکا ہے، دلوں کا چین مٹ چکا ہے اور اعتماد باہمی فنا ہو گیا ہے جو مدنیت صحیحہ کی روح ہے۔ بین الاقوامی تحریک لادینی کے دخل سے بین الاقوامی فساد بن کر رہ گئی ہے جس سے کسی قوم میں بھی سکھ اور چین باقی نہیں رہا۔

دراں حالیکہ بین الاقوامیت کی ضرورت پوری دنیا سے فساد مٹانے کے لئے تھی نہ کہ شر و فساد پھیلانے کے لئے' اس لئے صالح بین الاقوامیت بنانے کا ذریعہ دین کے سوا کوئی دوسرا نہیں ہوسکتا' لیکن اس غیر لادینی نظامِ ملت کے ہوتے ہوئے حقوق شہریت کے تحفظ اور مظلوموں کی بے لاگ حمایت سے کسی مشترکہ پلیٹ فارم کی نفی مقصود نہیں ورنہ یہ دینی تنظیم اس مخلوط تنظیم کے منافی ہے' بلکہ ایسی مخلوط تمدنی تنظیموں کے لئے یہ دینی تنظیم بجائے منافی ہونے کے معین ثابت ہوگی' کیونکہ جب تک دیانت و راست بازی کے ساتھ قلوب میں اخلاص اور مظلوموں کی حقیقی ہمدردی نہ ہوگی مشترک جماعتیں بے غرضی سے کام نہیں کرسکتیں اور یہ ہمدردی بغیر خدا پرستی اور نظام دین کی تکمیل کے ناممکن ہے' اس لئے یہ شہری یا مخلوط تنظیم جس کا حاصل صرف شہریت وتمدن کے حقوق کی نگہداشت اور مشترکہ آواز سے ان کے مطالبہ میں قوت پیدا کرنا ہے' اس دینی تنظیم ہی سے سچائی کی روح حاصل کرسکتی ہے۔

بہرحال امت کے سامنے دینی معیار سے نظم ملت کا پروگرام پیش کیا جانا اور اسے لے کر عملاً چلنا ازبس ضروری ہے' جس کی غرض و غایت اسلام کے بین الاقوامی پروگرام پر خود قائم ہوکر دلوں کی سچائی اور خلوص سے اسے دنیا کے سامنے پیش کرنا ہے' اسلام نے اپنی تنظیم عصبیت پر نہیں کی بلکہ فطرت پر کی ہے' اس لئے قدرتاً نہ تو اس میں تنگی ہے نہ تعصب اور ظاہر ہے کہ عالمگیر پروگرام پیش کرنے والا مذہب آلودۂ تعصب و تنگی ہو بھی نہیں سکتا۔ اس لئے اقوام کی طرف جس قدر اس نے سالمیت و رواداری کا ہاتھ بڑھایا ہے' اتنا یا اس کا عشر عشیر بھی کسی ملت نے نہیں بڑھایا بلکہ وہ ملتیں جن کا سرمایہ ہی محدود نظریات اور تنگ تنگ حد بندیاں ہوں عمومی رواداری اور بین الاقوامی سالمیت کا ثبوت دے بھی نہیں سکتیں۔

اندریں صورت آج کے دور میں اسلام کو دوسرے مذاہب پر قیاس کر کے یہ کہہ دینا کہ مذہب ایک شخصی اور انفرادی تعلق ہے جو بندہ اور خدا کے درمیان قائم ہوتا ہے اسے سیاست و معاشرت سے کوئی واسطہ نہیں' بلاشبہ اسلام کی بنیادوں کی تکذیب کر دینا ہے' مذہب و سیاست کی یہ تفریق ان مذاہب پر راست آسکتی ہیں جو حقیقتاً اجتماعیت سے خالی رہ کر صرف اعتقاد و عبادت تک محدود ہیں لیکن جو مذہب معاشرت' سیاست سے لے کر عبادت تک اجتماعیت گیری کا رنگ لئے ہوئے ہو' اور جس نے دنیا کی سیاست میں عالمگیری کا رنگ بھرا ہو' اسے انفرادیت کے مذہبوں پر قیاس کر کے محض عبادت کی حدود سمجھ لینا اور اسے صرف بندہ اور خدا کا درمیانی رشتہ کہہ کر پکارانا اسلام سے ناواقفیت یا محض مصلحت اندیشی کی علامت ہے جیسا کہ اس کے برعکس اسلام کو لادینی اجتماعیتوں پر قیاس کر کے اسے محض ایک بین الاقوامی تحریک سمجھ لینا جس میں بندہ اور خدا کا کوئی درمیانی رشتہ ملحوظ نہ ہو' افراط و تفریط اور اس کی تعلیمات سے بے خبری کا نتیجہ ہے۔

بہرحال ہماری اجتماعیت و تنظیم بین الاسلامی بھی ہے اور بین الاقوامی بھی ہے اور اس کے تحت بین الوطنی بھی ہے لیکن ان سب کی روح وہی اخلاقیت و روحانیت ہے جو اللہ کے قانون میں مذکور ہوتی ہے اس لئے بقاو ترقی اور تعمیر و تنظیم کی سب سے پہلی اور سب سے آخری منزل مسلمانوں کے لئے

قرآن کی تعلیم کو رائج کرنا اور اس کی طرف دنیا کو دعوت دینا ہے۔ امام مالکؒ نے اس بارہ میں اصل حقیقت سے پردہ اٹھا دیا ہے، فرمایا ہے:

لا یصلح أخر هذه الامة الا بما صلح به اولها۔

اس امت کے آخر طبقہ کی اصلاح بھی اسی چیز سے ہو سکتی ہے جس سے امت کے اول طبقہ کی اصلاح ہوئی (اور وہ بلاشبہ قرآن ہے)۔

پس اگر اس دور لادینیت میں مسلم قوم کو اپنے حال اور مستقبل کی طرف سے مطمئن ہونا ہے تو رسوم سے بالاتر ہو کر وہ اس لٹریچر کو سنبھالے جس نے ابتداء اسے جنم دیا تھا اور جو ماضی میں اس کی تشکیل اور تنظیم کا بے خطا معیار ثابت ہوا ہے، یعنی ''القرآن العظیم'' وہی آج بھی اس کی بقا و ترقی اور وحدت و تنظیم کا ضامن ہو سکتا ہے اور آج کی پارٹیوں کی تخریبی مساعی کے ہجوم میں بھی اگر اس کی روشنی ہمارے اندر اور باہر ہے تو اسلامی تہذیب و تمدن کا بال بھی بیکا نہیں ہو سکتا۔ وباللہ التوفیق۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

ڈاکٹر صلاح الدین اکبر، لاہور

دوستی

پچھلے دنوں پاکستان میں جب کرکٹ میچ ہو رہے تھے ایک ہنگامہ بپا تھا۔ یہ تھے تو بظاہر میچ ہی مگر جیسے ٹی وی کے ڈرامے Sponsered ہوتے ہیں جس میں سپانسر اپنی اپنی مصنوعات کی زیادہ سے زیادہ اشتہار بازی کرتے ہیں اسی طرح مختلف شعبوں کے بندے جن میں شوبز کے لوگ پیش پیش تھے، سیاسی شعبدہ باز بھی پیچھے نہ تھے۔ لالو پرشاد صاحب سے لے کر مشرقی پنجاب (بھارتی پنجاب) کے وزیراعلیٰ تک تشریف لائے۔

امن امن، دوستی، دوستی کی ہاہاکار مچی ہوئی تھی، ڈیلیگیشن آ رہے تھے، ڈیلیگیشن جا رہے تھے، مشترکہ کلچر، مشترکہ رہن سہن، ثقافت، زبان کا چرچا کچھ زیادہ ہی بلند آواز میں ہو رہا تھا، حتیٰ کہ سرحد کو لکیر تک کہا گیا۔۔۔ٹھیک ہے امن کے حامی ہم بھی ہیں، اسلام تو نام ہی امن اور سلامتی کا ہے۔ دوستی! آ منا وصدقنا، چشم ما روشن دل ما شاد۔۔ کھلے ذہن سے، کھلے دل سے آؤ، ادھر بھی گرم جوشی پاؤ گے۔۔مگر یہ مشترک کلچر، مشترک طریق رہن سہن، ثقافت۔۔اس پر ہمیں کچھ سوچنا ہوگا اور بین الاقوامی سرحد کو لکیر کا نام دینے سے کیا مطلب ہے اس پر بھی غور کرنا ہوگا۔

یہ حقیقت ہے کہ قیام پاکستان سے پہلے ہم اکٹھے رہتے رہے ہیں اور صدیوں اکٹھے رہے ہیں، پہلے مسلمان حکمران تھے، پھر مسلمان اور ہندو دونوں انگریز کی رعایا کے طور پر اکٹھے رہے، اس دوران سیاسی مصلحتوں کے تحت ہم نے معاشرتی رابطے استوار کئے، سیاسی جماعتوں میں شامل ہو کر اکٹھے جدوجہد بھی کی لیکن یہ ایک حقیقت ہے، سچائی ہے جسے کوئی جھٹلا نہیں سکتا کہ اس ہزار سال کے طویل عرصے میں ہم الگ الگ اکائیاں (Separate Entities) ہی رہے، ایک دوسرے میں ضم نہیں ہوئے۔ اور جب انگریز کے یہاں سے رخصت ہونے کا وقت آیا تو ہم نے محسوس کیا کہ اس کے بعد معروف مغربی جمہوریت میں ہماری حیثیت کیا ہوگی۔۔مغربی جمہوریت میں تو بندوں کو گنا کرتے ہیں (تولا نہیں کرتے) ون مَین ون ووٹ میں مذہب کے نام پہ ووٹ کے حساب سے تو ہم ہمیشہ اقلیت میں رہیں گے، ہمیشہ محکوم۔ ون مَین ون ووٹ انگلستان، جرمنی، فرانس میں تو چل سکتا ہے کہ پارٹیاں معاشی، معاشرتی پروگراموں پہ تشکیل پاتی ہیں، صحیح معنوں میں

ان کا کلچر' ان کی ثقافت' ان کی زبان ایک ہوتی ہے' مذہب کو گرجوں تک محدود کر کے اپنی سیاست کو وہ آزاد کر چکے۔۔مگر یہاں معاملہ کچھ اور ہے۔ ہماری ہر سوچ کا سرچشمہ ہی ہمارا دین ہے' وہی ہمیں دوسرے انسانوں سے حسن سلوک کا سبق دیتا ہے وہی ہمیں انصاف' عدل و احسان پہ مبنی معاشرے کا درس دیتا ہے' وہی ہمیں ایک توازن بدوش معاشرت کی تشکیل کا ڈھنگ سکھاتا ہے اور فلاح عامہ پر مبنی معیشت کی طرف راہنمائی کرتا ہے۔

منافرت مسلمان کے لئے اجنبی تصور ہے' اسلام تو ساری انسانیت کو امتِ واحدہ پکارتا ہے((2:213۔ پاکستان بنانے کی جدوجہد کسی سے دشمنی پر مبنی نہ تھی' صرف اپنے حقوق کا تحفظ تھا' اپنے کلچر' اپنی ثقافت اپنی زبان اپنے طرز زندگی۔۔ مختصراً اپنے فلسفہ زندگی کے مطابق جینے کا حق مانگنے کا نام تھا' اور یہ جدوجہد قائد اعظمؒ کی قیادت میں بڑے ہی قانونی طریقے سے بغیر تشدد پسندی کے جیتی گئی۔ قیام پاکستان سے کچھ پہلے اور کچھ بعد میں جتنا کشت وخون ہوا اسے پاکستان کے کھاتے میں ڈالنا زیادتی ہے' محض مخالفانہ پراپیگنڈہ ہے' یہ سب دراصل ہاری ہوئی اکثریت کا ردعمل تھا۔

قائداعظمؒ بڑا واضح تصور رکھتے تھے' دوٹوک بات کرتے تھے' ۱۹۴۰ء کے لیگ کے تاریخی اجلاس میں آپ نے فرمایا تھا۔

''یاد رکھئے ہندو اور مسلمان زندگی کے ہر معاملے میں جداگانہ فلسفہ رکھتے ہیں' دونوں کی معاشرت ایک دوسرے سے مختلف ہے' یہ دو الگ الگ تہذیبوں سے تعلق رکھتے ہیں جن کی بنیادیں متضاد تصورات پر ہیں۔۔''

کیا یہ ایک Rational سوچ پر مبنی بیان نہیں' کیا اس میں کہیں بھی عداوت یا دشمنی کا شائبہ بھی نظر آتا ہے۔ اور اسی سوچ کی بنیاد پر ہم نے جدوجہد کی اور اپنا مقصد حاصل کر لیا' چاہئے تو یہ تھا کہ اکثریت رکھنے والی جماعت اسے خوشدلی سے قبول کرتی' خود امن میں رہتی اور پاکستان کو امن میں رہنے دیتی مگر ایسا نہ ہوا' فسادات' کشت وخون نے مسائل کا ایک بوجھ اس نوزائیدہ مملکت پہ لاد دیا۔ دہلی میں تو بنا بنایا سیکریٹیریٹ تھا' انفراسٹرکچر تھا' روپیہ پیسہ تھا' فوج تھی۔ پاکستان تو تہی دست تھا' اسے تو اپنا آپ سنبھالنے ہی میں مدت لگ گئی' کسی اور طرف توجہ ہی نہ ہو سکی' اس دوران اس کی فعال قیادت منظر سے ہٹ گئی۔ سرمایہ دار' جاگیردار' بااثر خاندان' اونچے سرکاری نوکر ان کرسیوں پر براجمان ہو گئے جہاں سے وہ لوگوں کی زندگیوں سے کھیل سکتے تھے اور انہوں نے یہ کھیل خوب کھل کر کھیلا۔

قائداعظمؒ اور اقبالؒ کے خواب ہوا میں تحلیل ہو گئے' زمانے کے تقاضوں کے مطابق ایک اسلامی فلاحی مملکت جس کی معیشت قل العفو اور معاشرہ کس نہ باشد در جہاں محتاج کس کا عکاس ہونا تھا' جسے دنیا کے لئے ایک مثالی مملکت کا روپ اختیار کرنا تھا بھانت بھانت کے تجربوں کی گرد میں کھو گئی اور آج نصف صدی سے زیادہ عرصہ گزر جانے کے بعد ہم اپنی شناخت کی تلاش میں ہیں۔

آج دنیا بھر میں مسلمانوں اور صرف مسلمانوں کو

بنیاد پرست (Fundamentalist) اور دہشت گرد کہہ کر بدنام کیا جا رہا ہے۔ اور یہ اس معاشرت' اس تہذیب کے لوگ کہہ رہے ہیں جن کی اپنی بنیادیں ہی کوئی نہیں اور اگر کوئی ماضی کی روایات اور تاریخ ہے بھی تو دہشت گردی اور کمزوروں پہ ظلم اور کشت وخون کی ہے جو افریقہ سے غلام پکڑ کر لاتے تھے اور ملک کے اصلی باشندوں کو آہستہ آہستہ ختم کرتے رہے۔ آج جن کے پاس سب سے زیادہ خوفناک قوت ہے جس کے بل پر وہ جس کو چاہتے ہیں ڈراتے دھمکاتے اور پھر تباہ و برباد کر دیتے ہیں۔ اور یہ سب امن وتہذیب کے نام پر۔

میں نہ امن کے خلاف ہوں نہ علم و تہذیب کے' منافرت کے حق میں تو ایک طرف اسے سب کے لئے لعنت سمجھتا ہوں۔ اس کی وجہ سے میرا دین جو امن وسلامتی کا دین ہے دنیا میں بدنام ہو رہا ہے۔ لفظ جہاد کو وہ وہ معنی پہنائے جا رہے ہیں کہ جاننے والے انگشت بدنداں ہیں۔ یہ تو دنیا کو اپنی تمام تر مخلص جدوجہد کے ذریعے ایک جنت بداماں جگہ بنانے کی کوشش کا نام ہے جہاں کوئی اونچ نیچ نہ رہے' کوئی پسماندہ و محتاج نہ رہے' کوئی بھوکا' کوئی بے لباس نہ رہے' بے گھر نہ رہے' بے آسرا بے سہارا نہ رہے۔

مغرب تو اپنے مذہب سے بھی بے گانہ ہے اور اسلام کا نام ہم سے مسلمانوں نے بدنام کر رکھا ہے' ایسے میں حقیقت کسی پہ کیسے اشکار ہو' مغرب زتو بیگانہ مشرق ہمہ افسانہ۔۔

یہاں میں قائداعظمؒ کے کچھ لفظ دہرانا چاہ رہا ہوں' ۱۹۴۱ء میں آپ نے حیدرآباد عثمانیہ یونیورسٹی کے طالب علموں کے سوال کے جواب میں فرمایا تھا:

''جب میں انگریزی میں مذہب (Religion) کا لفظ سنتا ہوں تو اس زبان اور محاورے کے مطابق لامحالہ میرا ذہن خدا اور بندے کے باہمی پرائیویٹ تعلق کی طرف منتقل ہو جاتا ہے لیکن میں خوب جانتا ہوں کہ اسلام اور مسلمانوں کے نزدیک مذہب کا یہ محدود اور مقید مفہوم یا تصور نہیں۔

میں نہ کوئی مولوی ہوں نہ ملا نہ مجھے دینیات میں مہارت کا دعویٰ ہے البتہ میں نے قرآن مجید اور قوانین اسلام کے مطالعے کی اپنے طور پر کوشش کی ہے' اس عظیم الشان کتاب کی تعلیمات میں انسانی زندگی کے ہر باب کے متعلق ہدایات موجود ہیں' زندگی کا روحانی پہلو ہو یا معاشرتی' سیاسی ہو یا معاشی غرض کوئی شعبہ ایسا نہیں جو قرآنی تعلیمات کے احاطے سے باہر ہو۔''

آج معیشت نے زیادہ ہی بنیادی حیثیت اختیار کر لی ہے' امیر ملک غریب ملکوں کو معیشت کی برتری کے زور پہ فتح کر رہے ہیں' غلام بنا رہے ہیں۔ دنیا سرمایہ دارانہ نظام کے ہاتھوں ایک عذاب میں مبتلا ہے۔ کچھ باغیوں نے کمیونزم میں اس کا توڑ ڈھونڈا۔ بہت دیر سرمایہ دارانہ نظام اس کے مقابل مگر اس سے خائف رہا مگر بال آخر اس کی کمزوریوں سے فائدہ اٹھاتے ہوئے سرمایہ دارانہ نظام جیت گیا۔ مکر کی چالوں سے بازی لے گیا سرمایہ دار۔

قائداعظمؒ اس کشمکش سے خوب آگاہ تھے' معیشت کے متعلق انہوں نے سٹیٹ بینک آف پاکستان کی افتتاحی تقریب میں (جو ان کی زندگی کی آخری پبلک تقریر تھی) فرمایا:

''ہمارے پیش نظر مقصد یہ ہے کہ یہاں کے عوام خوشحالی اور اطمینان کی زندگی بسر کریں' اس مقصد کا حصول مغرب کے اقتصادی نظام کو اختیار کرنے سے نہیں ہو سکے گا' ہمیں اپنا رستہ آپ متعین کرنا چاہئے اور دنیا کے سامنے ایک ایسا نظام پیش کرنا چاہئے جو اسلامی مساوات اور عدل عمرانی کے اسلامی تصورات پر مبنی ہو' صرف یہی طریق ہے جس سے ہم اس فریضہ سے عہدہ برا ہو سکیں گے جو ہم پر مسلمان ہونے کی حیثیت سے عائد ہوتا ہے اور ہم دنیا کو وہ پیغام دے سکیں گے جو اسے تباہیوں سے بچالے اور نوع انسان کی بہبود و مسرت اور خوشحالی کا ضامن ہو سکے' یہ کام کسی اور نظام سے نہیں ہو سکتا۔''

افسوس کہ دوسروں کو راہ دکھانا تو ایک طرف ہم خود کسی منزل کو متعین کئے بغیر گم کردہ راہ قافلے کی صورت میں گھوم رہے ہیں' پچپن چھپن سال کی تھکن کے باعث ماندہ غیروں کے در پہ کشکول اٹھائے بھیک کے منتظر رہتے ہیں اور اس کی سب سے بڑی وجہ یہی ہے کہ ہم نے مبنی برانصاف معیشت قائم کرنے کی طرف ایک قدم بھی نہیں اٹھایا۔ خدا ناشناس مساواتِ شکم پر مبنی نظام کے خلاف تو ہمارے خود ساختہ اسلام پسند رہنماؤں نے نہ صرف آواز بلند کی بلکہ سرمایہ پرست مغرب کے آلۂ کار بن کر لڑے بھی اور اس نظامِ کفر کو بکھیرنے میں ممد و معاون ہوئے جو ایک دوسرے کفر کے مدمقابل اس کی عالمی اجارہ داری کے خلاف دیوار تھا۔

المیہ تو یہ کہ اسلام کا نام لے کر اٹھنے والوں کے پاس جذباتی نعروں سے زیادہ کوئی ٹھوس پروگرام تو کیا کوئی قابل ذکر لائحہ عمل اور سوچ بھی نہ تھی' وہ اسلام کو کچھ عبادات اور کچھ سزاؤں تک محدود نظام سمجھ پائے اور دنیا کو اسلام کا یہی رخ دکھاتے رہے۔ حالانکہ اسلام پڑھے لکھے لوگوں پر مشتمل ایک ایسی سلجھی ہوئی سوسائٹی قائم کرتا ہے جس میں اونچ نیچ' رنگ' نسل' زبان حتیٰ کہ مذہب بھی تعصب کا باعث نہیں بنتا۔ ایسا سیاسی نظام بناتا ہے جس میں باہمی مشورہ بنیادی حیثیت رکھتا ہے اور ہر شخص بلا لحاظ پیشہ اور پیسہ اتنا ہی اہم ہے جتنا کوئی حکومتی عہدیدار (حکومتی عہدیدار پر تو بلکہ ذمہ داریوں کا کہیں زیادہ بوجھ ہوتا ہے)۔ وہ ایک ایسا نظام معیشت قائم کرتا ہے جس میں حکومت نہ صرف ہر شخص کی بنیادی ضروریات زندگی روٹی' کپڑا' مکان' تعلیم کے یکساں مواقع' علاج معالجہ کی سہولیات' بڑھاپے' معذوری میں کفالت کی ذمہ دار ہوتی ہے۔ بلکہ ان کے دائرہ کار میں بسنے والے ہر مرد عورت کی Potential صلاحیتوں کو بروئے کار لانے کی بھی مکلف ہوتی ہے۔ اور جس قوم کی ساری خفتہ صلاحیتیں بیدار ہی نہیں بام عروج پہ پہنچیں وہ کیسے اقوام عالم میں سربلند ہی نہیں انتم الاعلون یعنی سپریم نہ ہوگی۔ آج کی دنیا میں سپریم ہونے کے لئے علم اور خاص طور پر سائنس میں عروج حاصل کرنا لازمی ہے' اسی کے بل بوتے پہ آج کی سپریم طاقت اپنے سامان

حرب وضرب کے بل بوتے پر فرعونِ وقت ہی نہیں، چنگیز و ہلاکو کا رول بھی لئے ہوئے ہے۔ مگر اسلام پر مبنی سپریم طاقت استحصال اور ظلم کی علامت نہیں ہوتی۔ یہ طاقت ہمیشہ پس ماندہ اور مجبور انسانیت کے لئے ڈھال ہوتی ہے چاہے مظلوم غیر مسلم ہی کیوں نہ ہو۔

ہمارا المیہ یہی ہے کہ ہم اسلام کا نام تو بہت لیتے ہیں مگر نہ اس کے پیغام کو سمجھتے ہیں، نہ اس پر عمل پیرا ہوتے ہیں ورنہ آج اقوام عالم میں اس طرح جاہل، پسماندہ اور ذلیل نہ ہوتے۔

بہت دیر ہو چکی، بھانت بھانت کی بولیوں میں قائداعظمؒ کی آواز بھی سنائی نہیں دیتی، طالب علموں کو انہوں نے ہمیشہ علم کے حصول میں لگن کی تلقین کی، سرمایہ داروں، جاگیرداروں، استحصال پسندوں سے ہمیشہ برأت کا اعلان کیا، اسلام کے معاشی نظام اور عدل عمرانی پر زور دیا۔ ''اتحاد، ایمان، تنظیم، ترقی کے حصول کے لئے لازمی قرار دیئے انہی پر عمل پیرا ہو کر اس قعر مذلت سے نکل سکتے ہیں۔ وقت بہت گزر چکا، زمانہ بہت آگے نکل گیا، ہمیں دن رات کی محنت درکار ہو گی، جہاں دوسرے چل رہے ہیں ہمیں دوڑنا ہو گا۔ بھوکے پیٹ لڑنا ہو گا، بہت مشکلات کا سامنا ہو گا مگر اتحاد، ایمان، تنظیم کے بل پہ ہم یقیناً اقوام عالم میں باعزت مقام حاصل کر سکتے ہیں۔

اگر ہم نے جہد و جہد کا یہ راستہ، حصول علم اور علم پر مبنی طاقت کا رستہ اختیار نہ کیا تو وہ وقت خدانخواستہ بہت دور نہیں کہ:

تمہاری داستاں تک بھی نہ ہو گی داستانوں میں

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

غلام باری، مانچسٹر، برطانیہ

علماء کون ہوتے ہیں؟

ہمارے ہاں جن حضرات کو علماء کرام کہا جاتا ہے قوانین فطرت کے متعلق ان کے مبلغ علم کے متعلق کچھ کہنے کی ضرورت نہیں۔ لیکن دیکھئے کہ قرآن کریم ''علماء'' کن لوگوں کو قرار دیتا ہے۔ سورۃ فاطر میں ہے کہ تم نے کبھی اس پر بھی غور کیا ہے کہ اللہ کے قانون کے مطابق آسمان سے ایک جیسا پانی برستا ہے لیکن اس سے مختلف انواع و اقسام کے پھل پیدا ہوتے ہیں۔ یہ نہیں ہوتا کہ سب پھل اور فصلیں ایک جیسی ہوں اور ''پہاڑوں کو دیکھو کہ ان کا مادہ تخلیق ایک ہی تھا لیکن ان میں مختلف رنگوں کے خطے ہیں۔ کوئی سفید، کوئی سرخ، کوئی کالا بھجنگ'' (اور ہر خطہ اپنے اندر ارتقائی منازل کی داستانیں مرقوم و محفوظ رکھے ہوئے ہے)۔ اسی طرح انسان اور دیگر حیوان اور مویشی بھی مختلف النوع ہیں ((35/27۔ آپ نے غور کیا کہ اس آیت کریمہ میں کن امور کا ذکر ہو رہا ہے۔ کائنات کے مختلف گوشوں کا۔ بساط فطرت کے متنوع شعبوں کا۔ سائنس کے مختلف علوم۔ طبعیات، نباتات، طبقات الارض، حیوانات اور انسانیت کے تمام شعبے اس کے اندر آجاتے ہیں۔ صحیفۂ فطرت کے یہ اوراق جو قوانین خداوندی کی زندہ شہادت ہیں سب کے سامنے کھلے رہتے ہیں لیکن ان قوانین کی عظمت کے سامنے وہی جھکتے ہیں جو ان پر علم و بصیرت کی رو سے غور کرتے ہیں۔ ان علوم و فنون کے تذکرہ کے بعد کہا گیا ہے! حقیقت یہ ہے کہ خدا کے بندوں میں سے ''علماء'' وہ ہیں جن کے دلوں پر اس کی عظمت اور ہیبت چھا جاتی ہے۔ کیونکہ وہ علیٰ وجہ البصیرت رموز و اسرار کائنات کا علم حاصل کر کے اس حقیقت کا مشاہدہ کر لیتے ہیں کہ خدا کتنی بڑی قوتوں کا مالک ہے اور کس طرح ایسے عظیم کارگۂ کائنات کو ہر قسم کی تخریب سے محفوظ رکھ کر آگے بڑھائے جا رہا ہے ((35/28۔ غور کیجئے کہ قرآن کریم نے ''علماء'' کا لفظ کن لوگوں کے لئے استعمال کیا؟ انہی کے لئے جنہیں ہم آج کل سائنس دان کہتے ہیں۔ دنیا کے مذاہب اور سائنس میں تصادم چلا آ رہا ہے۔ سائنس کو مذہب کی دشمن اور مذہب کو سائنس کی ضد کہا جاتا ہے۔ ان کے برعکس قرآن کریم کہتا ہے کہ سائنس کا ہر مبنی بر حقیقت انکشاف اس کے کسی نہ کسی دعوے کی صداقت کی شہادت یعنی ثبوت ہوگا ((41/53۔ اس لئے قرآن کریم کی رو سے سائنس کا علم حاصل کرنا ضروری ہے۔ ''حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی ایک حدیث مبارکہ ہے کہ علم حاصل کرو چاہے اس کے لئے چین جانا پڑے''۔ چین میں مدرسے نہیں تھے جہاں سے فقہی علم حاصل

کرنے کے لئے حضور ﷺ نے فرمایا تھا' بات سائنس اور ٹیکنالوجی کی تھی۔ سالوں بعد مسلمانوں نے کاغذ بنانے کا علم چین سے حاصل کیا تھا۔ جہاں تک انسانی راہنمائی اور امور مملکت کا تعلق ہے اس کے لئے قرآنی احکام و قوانین اور اصول وقدار کا مفہوم واضح اور متعین ہے۔ ان میں کوئی پیچ وخم نہیں اس لئے انہیں سمجھنے اور ان پر عمل پیرا ہونے کے لئے کسی مدرسہ کے کورس پاس کرنے کی ضرورت نہیں۔ مثلاً عبرت حاصل کرنے کے لئے انبیاءؑ سابقہ اور اقوام گزشتہ کے تاریخی شواہد میں ہے کہ فلاں قوم نے قوانین خداوندی اپنائے تو انہیں اپنی ہمعصر اقوام پر فضیلت حاصل ہوگئی اور جب بعد میں' اپنے نبی کی کتاب کے مطابق متشکل کردہ نظام (دین) کی بجائے اپنے خودساختہ قوانین اور جذبات وخواہشات (مذہب) کے مطابق زندگی بسر کرنی شروع کردی تو ان کی موت واقع ہوگئی یعنی ان پر زوال آ گیا یہ کفر کی زندگی ہے۔ بارش کی مثال سے سمجھایا گیا ہے کہ یہ ہمارے قانون کے مطابق برستی ہے اس لئے زمین مردہ کو حیات تازہ مل جاتی ہے۔ اگر کوئی مردہ (زوال پذیر) قوم ہمارے قوانین کے مطابق اپنا معاشرہ متشکل کر لے تو اسے بھی اسی طرح حیاتِ نو مل جائے گی یعنی عروج حاصل ہو جائے گا۔ جب وہ اسلامی مملکت کے متعلق کہتا ہے کہ ان کے معاملات باہمی مشاورت سے طے ہوں گے تو کیا اس اصول کا مفہوم سمجھنے میں کسی قسم کا الجھاؤ یا اختلاف پیدا ہو سکتا ہے؟ قرآن کریم اصول دیتا ہے ان اصولوں کو بروئے کار لانے کا پروگرام ہر دور کی قرآنی مملکت اپنے زمانے کے تقاضوں کے مطابق وحی کی روشنی میں خود متعین کرے گی۔ اس میں اپنے آپ بن بیٹھنے والے علماء کرام اور مشائخ حضرات کا کیا کام جو آپس کے اختلافات ختم نہیں کر سکتے۔ انہی اختلافات کی وجہ سے کسی بھی مسلم ملک میں دین قائم نہیں ہو رہا اور تو اور ان کے علم کی رو سے قاعدوں اور کتابوں میں بچے جب لا الہٰ الا اللہ کا ترجمہ There is no god but God پڑھتے ہیں تو ان کی سمجھ میں کچھ نہیں آتا لیکن جب ان سے کہا جائے گا کہ There is no Sovereign except ALLAH تو فوراً بات ان کی سمجھ میں آ جائے گی۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

سید امتیاز احمد

پھول جو میں نے چُنے

''اسبابِ زوالِ اُمت''

جو قوم تسخیرِ فطرت نہیں کرتی اس کے لئے وحی کی مستقل اقدار کے مطابق زندگی بسر کرنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ جسے مقامِ آدمیت بھی نصیب نہیں اسے مقامِ مومن کس طرح نصیب ہوسکتا ہے۔

☆☆☆

جو کچھ قرآن میں بیان ہوا ہے اسے اس کے صحیح مقام پر رکھ کر دیکھئے' اس کا نتیجہ ہدایت ہوگا لیکن اسے اس کے مقام سے ہٹا کر اپنے معتقدات اور نظریات کے تابع رکھ دیا جائے تو اس کا نتیجہ گمراہی ہوگا۔ مسلمان کے ساتھ یہی ہو رہا ہے۔

☆☆☆

مقاصد کی تخلیق جدتِ فکر و ندرتِ خیال کی رہین ہوتی ہے۔ اگر کسی قوم میں فکر کی تازگی برقرار نہ رہے..... تو وہ قوم تخلیق کی اہل نہیں رہتی۔

☆☆☆

حیاتِ انسانی ایک ناقابل تقسیم وحدت ہے..... یہ ایک جوئے رواں ہے جو اس دنیا سے بڑھتی ہوئی آخرت تک مسلسل چلی جاتی ہے۔ زمان کی صراطِ مستقیم پر مختلف نشانات' گز پر گرہوں کے نشانات ہیں اور بس۔

☆☆☆

ملوکیت ہر اس نظام کا نام ہے جس میں دنیاوی امور کے لئے قانون کا سرچشمہ قرآن سے الگ ہو' خواہ اس کی شکل بادشاہت کی ہو یا جمہوریت کی۔

☆☆☆

ہماری حالت یہ ہے کہ ہم میں سے بڑے سے بڑا روحانیت کا دعوے دار بھی تھوڑی تھوڑی تک اسی دنیا کی ضروریات میں غرق ہوتا ہے اور زبان سے ہم میں سے ہر شخص دنیا پر لعنت بھیجتا ہے۔

☆☆☆

دین کے ارکان و مناسک اسی غیر مرئی حقیقت کو محسوس و مشہود شکل میں لانے کے ذرائع و اسباب تھے جن سے اس نظامِ زندگی کو عملاً متشکل ہونا تھا جسے اس نے ''الدین'' کہہ کر پکارا ہے۔

☆☆☆

کائنات میں ہر شے اپنی ارتقائی منازل طے کرتی ہوئی آگے بڑھتی چلی جاتی ہے۔ جو شے کسی سبب سے آگے بڑھنے سے رک جاتی ہے وہ ختم ہو جاتی ہے۔ آفاقی دنیا کی طرح انسانی دنیا میں بھی یہی قانونِ ارتقاء جاری و ساری ہے۔

☆☆☆

اگر اشتراکیت کے معاشی نظام کے بعض اجزاء اسلام کے معاشی نظام کے بعض اجزاء سے ملتے ہیں تو اس سے اشتراکیت اور اسلام ایک نہیں ہو جاتے۔ ان دونوں میں بُعد المشرقین ہے' ایسا بُعد کہ نہ کوئی اشتراکی مسلمان ہوسکتا ہے نہ کوئی مسلمان اشتراکی۔

☆☆☆

تقلید سے انسان کی نگاہ ایسی غلط انداز ہو جاتی ہے کہ وہی عقل و دانش جو اس کے لئے مابہ الامتیاز تھی' اسے مارِ سیاہ بن کر دکھائی دینے لگ جاتی ہے۔

☆☆☆

انسانی صلاحیتوں کی نشوونما' انسانی معاشرہ سے الگ ہو کر زاویہ نشینی اور خلوت گزینی کے چلوں سے نہیں ہوسکتی۔ یہ ہو سکتی ہے انسانی معاشرہ کے اندر' معاشرتی زندگی میں۔

☆☆☆

صدیوں کی تقلید سے مسلمانوں کا ذہن مساجد کے حجروں اور خانقاہوں کے غاروں کی طرح تاریک ہو چکا ہے۔ جس میں عقل کی روشنی کی کوئی شعاع کہیں سے بار نہیں پاسکتی۔

☆☆☆

حال کے پیش پا افتادہ مفاد بالکل ابھرے ہوئے سامنے ہوتے ہیں۔ لیکن مستقبل کے مفاد نگاہوں سے اوجھل ہوتے ہیں لہٰذا مستقبل کے مفاد کے لئے وہی کوشش کرے گا جسے اس کوشش کے اَن دیکھے نتائج پر پورا پورا یقین ہو۔

☆☆☆

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

محمد طاہر بٹ

ہمیں کیسا پاکستان چاہئے!

وہ خطۂ سرزمین جسے ۱۴ اگست ۱۹۴۷ء کو پاکستان کہلانے کا فخر حاصل ہوا اللہ تعالیٰ کے کرم، قائداعظمؒ کی ولولہ انگیز قیادت اور برصغیر جنوبی ایشیاء کے مسلمانوں کے جذبۂ حریت، ایثار و قربانی اور وحدت فکر و عمل کا ایک عظیم اور تاریخی انعام ہے۔

پاکستان کا قیام مسلمانانِ برصغیر کی عظیم انقلابی تحریک کی اہم منزل تھی جسے حاصل کرنے کے بعد ایک نئے سفر کا آغاز ہوا۔ وطن عزیز کو نظریۂ پاکستان کے مطابق ایک ترقی یافتہ اور خوشحال مملکت بنانے کا سفر۔ لیکن اس سفر میں ہمارے ہمسفر کچھ سامری بھی تھے جن کی تعداد وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ کم نہیں ہوئی بلکہ بڑھتی چلی گئی ہے۔ یہ وہی سامری ہیں جب حضرت موسیٰؑ اپنی قوم کو لے کر الگ خطۂ ارض پر جا بسے تو سامری بھی ہمراہ چلا آیا اور قوم کو حضرت موسیٰؑ کی غیر موجودگی میں گمراہ کرتا رہا۔ وہ ایک سامری تھا یہاں قائداعظمؒ جب آئے تو کئی سامری بھیس بدل کر ہمراہ چلے آئے اور آج تک قوم کو گمراہ کر رہے ہیں اور شاید اسی لئے منزل سامنے نظر نہیں آتی اور ہم بھٹکتے جا رہے ہیں۔ نصف صدی گزر چکی اور اب وقت آ چکا ہے کہ ہم اپنے ماضی کا جائزہ لیتے ہوئے حال کو سمجھیں تاکہ مستقبل کا فیصلہ کیا جا سکے کہ ''ہمیں کیسا پاکستان چاہئے؟'' اور ہماری منزل کون سی ہے؟ اور اب ہمیں کس ہمسفر کے ساتھ کون سے راستے پر سفر کرنا ہے؟

ماضی

☆ ۱۶۸۵ء میں سیوا جی کے سپوت سنبھا جی بولے ''مسلمان ملیچھوں کو ڈھونڈ ڈھونڈ کر صاف کر دو''۔ (تاریخ مہاراشٹر، بھائی پرمانند)

☆ ٹیپو سلطان جیسا مرد مجاہد جب وطن کو انگریز سے آزاد کروانے کی جدوجہد کر رہا تھا (۱۷۸۲ء تا ۱۷۹۹ء) ہندو اس سے لڑتے رہے اور غدار ملت میر صادق کو ابھار کر مسلمانوں کی امیدوں کی ایک اور شمع کو گل کر دیا۔

☆ مسلمانوں کے خون سے ہاتھ رنگنے والا اور ان کی عورتوں کو بے حرمت کرنے والا سیدھا سورگ (جنت) میں جائے گا۔ (لالہ دھنپت رائے)

☆ پوری قوم کو جل جانے دو ہم پاکستان کے نام پر ایک انچ زمین نہیں دیں گے۔ (گاندھی)

☆ ۱۹۳۸ء میں ڈاکٹر ذاکر حسین کی سربراہی میں اور ابوالکلام آزاد کی سرپرستی میں نئی تعلیمی پالیسی ''واردھا اسکیم'' بنائی گئی۔ اس اسکیم میں یہ کہا گیا کہ مذہب سب برابر ہیں۔ ''بچوں کو آپ پڑھا نہیں سکتے کہ اسلام دین حق ہے''۔ (کچھ غیرت مند

مسلمانوں کی وجہ سے یہ وار دھا اسکیم آگے نہ بڑھ سکی۔)

☆ پاکستان کا قیام ایک عارضی حادثہ ہے۔ پاکستان کو مٹا دینے کے لئے ۳۰ کروڑ ہندوؤں کو جان بھی دینی پڑے تو اس کے لئے تیار رہنا چاہئے۔ (دیوان چمن لال)

☆ ۱۹۴۷ء میں پاکستان وجود میں آیا تو رام راج کے پجاریوں نے ۱۰ لاکھ مسلمانوں کو شہید کر ڈالا' ان کے محلے کے محلے جلا دیئے گئے' لاتعداد خواتین کو بے حرمت کیا گیا اور اغوا کیا گیا۔ مکان' دکانیں' ٹرینیں لوٹی گئیں۔ پانی میں نیلا تھوتھا کا زہر ملایا گیا۔ مسلمان زندہ جلائے گئے۔ ان کے اعضاء قطع کئے گئے' بچوں کو نیزوں پر اچھالا گیا۔ ہزاروں مسجدوں کو مندروں اور گردواروں میں تبدیل کر دیا گیا۔ حاملہ خواتین کے پیٹ چاک کر کے جنین تک قتل کئے گئے۔ خود بھارتی حکومت کے اعداد و شمار کے مطابق ۱۹۴۷ء سے آج تک ملک میں دس ہزار سے زیادہ بلوے مسلمانوں کے خلاف ہو چکے ہیں۔ (کمال یہ ہے کہ کسی ہندو کو ان بلووں کی پاداش میں سزا نہیں دی گئی) دنیا کی تاریخ میں ایسی اندھیر نگری کسی قوم نے نہیں مچائی۔

☆ ''ہندوستان' نظریئے اور عمل دونوں اعتبار سے ایک ہندو اسٹیٹ ہو گی۔ جس کا مذہب ہندو ہو' کلچر ہندو ہو اور حکومت ہندوؤں کے ہاتھ میں ہو''۔ (ڈاکٹر رادھا مکر جی' نائب صدر ہندو مہا سبھا ۱۹۳۸ء)۔

☆ ''اذان اور نماز کے وقت مسجد کے آگے باجا بجانا ہر ہندو کے دھرم کا حصہ ہونا چاہئے۔'' (لالہ ہر دیال ۱۹۲۵ء)۔

☆ بھارت ماتا کے مسلمانوں کا ایک ہی مستقبل ہے کہ وہ دوبارہ ہندو ہو جائیں۔ ایک اور مستقبل بھی ہے کہ انہیں مٹی میں دبا دیا جائے''۔ (مہاشہ کرشن: اخبار پرتاب ۱۹۳۰ء)۔

☆ ''پاکستان کی اسلامی حکومت میں اطاعت صرف اللہ کی ہو گی یعنی قرآن کے اصولوں اور احکام کی۔ اسلام میں درحقیقت نہ کسی بادشاہ یا ڈکٹیٹر کی اطاعت ہے نہ پارلیمنٹ کی نہ کسی اور شخص یا ادارے کی۔ اسلامی حکومت قرآنی اصولوں اور احکام کی حکمرانی کا نام ہے۔'' (قائداعظمؒ ۱۹۴۱ء عثمانیہ یونیورسٹی حیدرآباد' دکن کے طلباء سے خطاب)۔

☆ ہندوستان میں ایک قوم نہیں بستی بلکہ مسلمان اور ہندو دو جداگانہ قومیں بستی ہیں (سرسید احمد خانؒ ۱۸۶۵ء)۔

☆ ہندوستان کے مسلم اکثریتی علاقوں میں ان کی آزاد حکومت قائم ہونی چاہئے۔ (علامہ اقبالؒ اجلاس الہٰ آباد ۱۹۳۰ء)۔

☆ تحریک پاکستان کے متعلق نیشنلسٹ علماء' ابوالکلام آزاد' حسین احمد مدنی' مودودی' مجلس احرار' سرخپوش' خان عبدالغفار وغیرہ کا کہنا تھا کہ ہندو ہمیں نماز روزے سے نہیں روکتا تو ہمیں پاکستان کی کیا ضرورت ہے؟

اس کے جواب میں علامہ اقبالؒ نے ارشاد فرمایا:

مُلا کو جو ہے ہند میں سجدے کی اجازت
ناداں یہ سمجھتا ہے کہ اسلام ہے آزاد

☆ ہمارا کوئی دوست نہیں ہے۔ ہمیں نہ انگریزوں پر بھروسہ ہے نہ ہندو بنئے پر' ہم دونوں کے خلاف جنگ کریں گے خواہ وہ آپس میں متحد کیوں نہ ہو جائیں۔ (قائداعظمؒ اجلاس عام پشاور ۲ نومبر ۱۹۴۵ء)۔

☆ ''ہمیں جو دکھ دیا گیا ہے اس کی مثال تاریخ میں نہیں

ملتی۔ مگر ہمیں پاکستان کو قائم رکھنے کے لئے ابھی اور قربانیاں دینا ہوں گی۔ مسلمان مصیبت میں گھبرایا نہیں کرتا۔ ہمارے حوصلے بلند ہیں۔ اگر اسی طرح تمام ملت ہمت اور صبر کے ساتھ کام کرتی رہی تو ہماری مصیبتیں انشاء اللہ بہت جلد ختم ہو جائیں گی۔'' (قائداعظمؒ لاہور ۱۳۰ اکتوبر ۱۹۴۸ء)۔

☆ خدا کی قسم' جب تک ہمارے دشمن ہمیں اٹھا کر بحیرۂ عرب میں نہ پھینک دیں' ہم ہار نہ مانیں گے۔ پاکستان کی حفاظت کے لئے میں تنہا لڑوں گا' اس وقت تک لڑوں گا جب تک میرے ہاتھوں میں سکت اور میرے جسم میں خون کا ایک قطرہ بھی موجود ہے۔ مجھے آپ سے یہ کہنا ہے کہ اگر کبھی کوئی ایسا وقت آ جائے کہ پاکستان کی حفاظت کے لئے جنگ لڑنی پڑے تو کسی صورت میں ہتھیار نہ ڈالیں اور پہاڑوں میں' جنگلوں میں' میدانوں میں اور دریاؤں میں جنگ جاری رکھیں۔ (فرمان قائداعظمؒ: بحوالہ سردار عبدالرب نشتر)۔

☆ خدا نے ہمیں یہ سنہری موقع عطا کیا ہے کہ ہم ثابت کر دکھائیں کہ ہم واقعی ایک نئی مملکت کے معمار ہونے کی اہلیت رکھتے ہیں۔ خدارا' کہیں لوگ ہمارے متعلق یہ نہ کہیں کہ ہم یہ بار اٹھانے کے قابل ہی نہ تھے۔ (قائداعظمؒ: افواج پاکستان کے افسروں سے خطاب' کراچی ۱۱ اکتوبر ۱۹۴۷ء)۔

☆ اس مشینی زمانے میں جبکہ انسان کی گمراہ کن ذہانت تباہی و بربادی کے نئے نئے انجن ہر روز ایجاد کرتی رہتی ہے' آپ کو زمانے کے مطابق چلنا پڑے گا اور اپنے علم' ساز و سامان اور اسلحے کو جدید ٹیکنیکوں کے مطابق رکھنا پڑے گا۔ اس لئے نہیں کہ ہم اپنے کسی پڑوسی کے خلاف بری نیت رکھتے ہیں' بلکہ اس لئے کہ ہماری سلامتی کا یہ بنیادی تقاضا ہے کہ ہم کمزور نہ رہیں' ہم پر کوئی اچانک حملہ نہ کر سکے۔ اس سے زیادہ ہماری کوئی خواہش نہیں ہے کہ ہم امن و امان کے ساتھ رہیں' دوسروں کو امن و امان سے رہنے دیں اور بیرونی مداخلت کے بغیر اپنے نقطہ نظر کے مطابق اپنے ملک کو ترقی دیں اور عام انسان کی زندگی کو بہتر سے بہتر بنائیں۔ بے شک یہ بہت مشکل اور کٹھن کام ہے لیکن اگر ہم شوق اور خلوص سے کام کرنے کا عزم کر لیں اگر ہم اپنی قوم کے اجتماعی مفاد کی خاطر بڑی سے بڑی قربانیاں دینے کے لئے تیار رہیں تو ہم اپنا نصب العین بہت جلد حاصل کر لیں گے۔ (قائداعظمؒ: بری فوج کے جوانوں سے خطاب' ۲۱ فروری ۱۹۴۸ء)۔

☆ کشمیر سیاسی اور فوجی اعتبار سے پاکستان کی شہ رگ ہے۔ کوئی خوددار ملک اور قوم یہ برداشت نہیں کر سکتی کہ اپنی شہ رگ کو دشمن کی تلوار کے حوالے کر دے۔ (قائداعظمؒ: وفات سے چند روز قبل)۔

☆ ۲۸ مئی ۱۹۹۸ء قائداعظمؒ کے فرمان کی تعبیر کے مطابق پاکستان ایٹمی طاقت بن گیا۔

☆ ''میں اللہ کا شکر ادا کرتا ہوں'' (وزیراعظم میاں محمد نواز شریف)۔

حال

☆ دنیا میں جہاں کہیں بھی مسلمان بستے ہیں اور ان پر ظلم و ستم کیا جا رہا ہے تو کیا پاکستان ان کی حمایت یا مدد سے گریز تو نہیں کر رہا؟

☆ ڈاکٹر ذاکر حسین کی سربراہی میں اور ابوالکلام آزاد کی سرپرستی میں نئی تعلیمی پالیسی ''واردھا اسکیم'' بنائی گئی تو کیا اب بھی

پاکستان میں کسی دوسری قوم کو خوش کرنے کے لئے تعلیمی پالیسی تبدیل تو نہیں کی جارہی؟

☆ دیوان چمن لال کا بیان کہ ''پاکستان کا قیام ایک عارضی حادثہ ہے''۔

کیا ہمارا آج کا عمل اس کو سچ ثابت کرنے میں مدد تو نہیں کررہا؟

☆ ''بھارت ماتا کے مسلمانوں کا ایک ہی مستقبل ہے کہ دوبارہ ہندو ہوجائیں''۔

کیا ہندوستان میں موجود مسلمانوں کے ساتھ پاکستان کے مسلمانوں کو بھی ہندو تو نہیں ہونا پڑے گا؟

☆ ''پاکستان کی اسلامی حکومت میں اطاعت صرف اللہ کی ہوگی یعنی قرآن کے اصولوں اور احکام کی''۔ (قائداعظمؒ)۔

کیا پاکستان میں اطاعت اللہ کے سوا کسی اور کی تو نہیں؟

کیا پاکستان کے حکمران بھی اللہ کے احکامات کی بجائے کسی نہ کسی بیرونی طاقت کے احکامات کے تابع تو نہیں؟

☆ پاکستان بنانے کی کیا ضرورت ہے؟

کیا علماء پاکستان بننے کے بعد بھی اس بات کو سمجھ سکے ہیں یا نہیں؟

☆ ہمارا کوئی دوست نہیں ہے۔ ہمیں نہ انگریزوں پر بھروسہ ہے نہ ہندو بنئے پر۔ (قائداعظمؒ)۔

کیا آج ہم کسی ایسے ہی دشمن کو دوست تو نہیں بنا رہے جو دوست بن کر آستین کے سانپ کا کردار ادا کرے؟

☆ کیا آج کے ہمارے عمل سے بزرگوں کی دی گئی قربانیاں رائیگاں تو نہیں ہورہیں؟

☆ کیا پاکستان کی حفاظت کی بجائے اپنی ذاتی حفاظت کے پیش نظر ایک دفعہ پھر بغیر لڑے جنگ تو نہیں ہاری جارہی؟

☆ کیا ہم اپنی شہ رگ کو ہندو رام راج کی میٹھی چھری کے حوالے کرکے اس قربانی کے بکرے کی طرح تو نہیں کررہے جو قربان ہوجاتا ہے اور احتجاج بھی نہیں کرتا؟

☆ کیا ہم اپنی حفاظت کرنے والی ایٹمی طاقت کو بکنے والی چیز تو نہیں سمجھ رہے؟

☆ کیا اپنے وطن کی حفاظت کرنے والی اسلام کا سربلند رکھنے والی تلوار، طاؤس ورباب کے نشے میں زنگ آلود تو نہیں ہورہی؟

☆ کیا پاکستان کے حالات پاکستان بننے سے پہلے جیسے تو نہیں ہورہے؟

مستقبل

آج پاکستان اور عالم اسلام ایسے مقام پر کھڑے ہیں کہ پوری امت مسلمہ کے ہاتھ اللہ کی جانب اٹھے ہوئے ہیں اور حسرت بھری نظریں اسلام کے قلعہ پاکستان کی جانب دیکھ رہی ہیں۔ شاید یہ کہتے ہوئے کہ کون سی جماعت مومنین ہے جو اللہ سے کئے وعدے کو یاد کرے گی اور پورا کرنے کے لئے میدان میں آئے گی۔

اب وہ وقت آ گیا ہے کہ ہمیں من حیث القوم سوچنا ہوگا کہ ہمارا مستقبل کیا ہے؟ ماضی کو یاد کرتے ہوئے ہمارا حال ہمیں سوچنے پر مجبور کرتا ہے کہ ہمیں کبوتر کی طرح آنکھیں بند کرنے کی بجائے کوئی اور لائحہ عمل اختیار کرنا ہوگا وگرنہ (خاکم بدہن) ہماری داستاں تک بھی نہ ہوگی داستانوں میں۔

ہمیں اپنے مستقبل کے لئے فیصلہ کرنا ہوگا کہ ''ہمیں کیسا پاکستان چاہئے؟''۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

خواجہ ازہر عباس، فاضل درس نظامی

حضرت امام مہدی کی آمد کا عقیدہ قرآن کے خلاف ہے

انسانیت کو جو علوم وحی کے ذریعے ملے وہ ہمیشہ ہمیشہ کے لئے صحیح ہوتے ہیں کیونکہ وہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے عطا شدہ ہوتے ہیں۔ لیکن بشری عقل سے جو علوم حاصل ہوتے ہیں وہ غلطی وسہو سے مبرا نہیں ہوتے۔ وحی خداوندی اور علم انسانی میں بنیادی فرق یہ ہے کہ اللہ نے انسان میں علم حاصل کرنے کی صلاحیت رکھ دی ہے۔ وہ تجربے، مشاہدے، غور وفکر اور تفحص وتعقل سے علوم حاصل کرتا ہے یہ علوم اس کو اس کے حواس کے ذریعے ملتے ہیں اس لئے اس علم کو ادراک بالحواس کہا جاتا ہے۔ قرآن کریم میں دو آیات کریمات میں اس علم کو خود Define کر دیا ہے۔ ارشاد ہوتا ہے:

ولا تقف ماليس لک به علم ان السمع والبصر و الفؤاد كل اولئک كان عنه مسئولاً ((17:36۔

جس بات کا تمہیں علم نہ ہو اس کے پیچھے نہ لگ جاؤ، تمہاری سماعت، بصارت اور عقل ہر ایک سے سوال کیا جائے گا۔

دوسری جگہ ارشاد ہوتا ہے:

لهم قلوب لا يفقهون بها ولهم اعين لا يبصرون بها ولهم اذان لا يسمعون بها ((7:179

ان کے دل ہیں مگر وہ غور نہیں کرتے، ان کی آنکھیں ہیں مگر وہ نہیں دیکھتے، ان کے کان ہیں مگر وہ ان سے نہیں سنتے۔

ان دونوں آیات کریمات میں قرآن کریم نے علم کو Define کر دیا ہے کہ علم حاصل کرنے کے ذرائع حواس انسانی ہیں، اسی وجہ سے اس علم کو علم بالحواس کہا جاتا ہے۔

اس کے برخلاف ایک علم وہ ہے جسے اللہ تعالیٰ اپنے خاص بندوں کو عطا کرتا تھا، جس میں علم حاصل کرنے والوں کے خیالات و احساسات کو قطعاً کوئی دخل نہیں ہوتا تھا۔ اس علم کو وحی خداوندی کہا جاتا ہے اور جسے یہ علم عطا کیا جاتا تھا وہ رسول یا نبی کے نام سے موسوم ہوتا ہے۔ وحی خداوندی کا نزول اس اہتمام کے ساتھ ہوتا تھا کہ اللہ تعالیٰ اس کے آگے اور پیچھے محافظ لگا دیتا تھا تاکہ وحی میں کسی قسم کی آمیزش نہ ہونے پائے اور اس لئے بھی کہ وہ (اللہ تعالیٰ) جان لے کہ انہوں نے اپنے رب کے پیغامات پہنچا دیئے ((26:28۔ اس اہتمام کی وجہ یہ ہے کہ وحی الٰہی میں کسی قسم کی آمیزش نہ ہو جائے اور اس کے بعد اللہ تعالیٰ نے وحی کی حفاظت کی ذمہ داری بھی خود ہی اپنے ذمہ لے لی۔

قرآن کی ان آیات سے ظاہر ہوتا ہے کہ علم حاصل ہونے کے صرف دو ہی ذریعے تھے، ایک عقل انسانی اور دوسرا وحی

الٰہی۔ اس کے علاوہ کوئی اور ذریعہ علم حاصل کرنے کا نہیں تھا اور چونکہ اب وحی کا سلسلہ ختم ہوگیا ہے اس لئے اب علم حاصل کرنے کے دو ذریعے عقل انسانی اور قرآن کریم ہیں۔ وحی صرف انبیاء علیھم السلام کو حاصل ہوتی تھی جس کی وضاحت ان دو آیات کریمات میں کردی گئی ہے۔

عالم الغیب فلا یظھر علی غیبہ احدًا الا من ارتضی من رسول (72:26)-

وہی غیب دان ہے اور اپنی غیب کی بات کسی پر ظاہر نہیں کرتا، مگر جس پیغمبر کو پسند فرمائے۔

نیز ارشاد ہوا:

وما کان اللّٰہ لیطلعکم علی الغیب ولکن اللّٰہ یجتبی من رسلہ من یشاء ((3:179۔

خدا ایسا بھی نہیں ہے کہ تمہیں غیب کی باتیں بتادے مگر وہ اپنے رسولوں میں سے جسے چاہتا ہے غیب بتانے کے لئے چن لیتا ہے۔

انبیاء کرام کے علاوہ نہ تو کوئی شخص وحی میں شامل ہوسکتا تھا اور نہ ہی یہ بات جان سکتا تھا کہ وحی کے نزول کے وقت انبیاء کرام کی کیا کیفیت ہوتی تھی، وہ کیفیت صرف انبیاء کرام کے ساتھ مخصوص ہوتی تھی۔ نیز ان آیات سے یہ بھی واضح ہوگیا کہ انسانیت کو علم خداوندی حاصل ہونے کا واحد ذریعہ وحی الٰہی تھا۔ اس کے علاوہ کوئی ذریعہ علم خداوندی حاصل ہونے کا نہیں تھا۔ انبیاء کرام کو بھی گذشتہ واقعات یا آئندہ امور کے متعلق جن باتوں کا علم دیا گیا وہ صرف وحی کے ذریعے دیا گیا۔

ذلک من انبآء الغیب نوحیہ الیک 3:43

نیز 11:49, 12:102۔

انبیاء کرام کے پاس بھی علم حاصل کرنے کے دو ہی ذریعے ہوتے تھے، ایک تو ان کی عقل سلیم اور دوسرے وحی الٰہی، کوئی تیسرا ذریعہ ان کے پاس بھی علم حاصل کرنے کا نہیں ہوتا تھا، اس بات کو قرآن کریم نے باصرار واضح کیا ہے اور اس بات کو اہمیت دی ہے کہ انبیاء کرام کے پاس ان دو ذرائع کے علاوہ کوئی اور ذریعہ اکتساب علم کا نہیں ہوتا تھا۔

سنت اللہ یہی ہے کہ دیگر انبیاء کرام کی طرح، حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے پاس بھی علم حاصل کرنے کے دو ہی ذریعے تھے، ایک تو ان کی عقل سلیم وبصیرت انسانی اور دوسرے وحی الٰہی جو صرف اور صرف قرآن کریم میں محفوظ ہے۔ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو اللہ تعالیٰ کی طرف سے جو علم حاصل ہوا وہ صرف قرآن کریم ہی حاصل ہوا ہے۔ جیسا کہ ارشاد باری تعالیٰ ہے۔

وما علمنہ الشعر وما ینبغی لہ، ان ھو الا ذکر وقران مبین ((36:69۔

اور نہیں سکھایا ہم نے اس کو شعر اور نہیں لائق اس کے وہ، نہیں وہ بجز ایک نصیحت اور روشن کتاب (موضح القرآن)۔

اس آیت کریمہ میں نفی واثبات کے حصر کے ساتھ واضح طور پر بتایا گیا ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو جو بھی تعلیم اللہ تعالیٰ کی طرف سے ملی تھی وہ صرف اور صرف ذکر یعنی قرآن کریم ہے۔ اس کے علاوہ ہر قسم کی تعلیم کی نفی کردی گئی ہے۔ کیونکہ یہاں جو ضمیر کا مرجع تعلیم ہے اور جو بھی تعلیم دیا گیا ہے وہ صرف ذکر یعنی قرآن ہے۔ ذکر کی وضاحت خود قرآن نے سورہ حم سجدہ میں یوں فرمائی کہ:

ان الذین کفرو بالذکر لما جاء ھم وانه لکتب عزیز o لا یاتیه الباطل من بین یدیه ولا من خلفه تنزیل من حکم حمید-)o(42-41:41

تحقیق وہ لوگ کہ کافر ہوئے ساتھ ذکر کے جب آیا ان کے پاس اور تحقیق وہ اللہ کی ایک کتاب ہے عزت والی۔ جھوٹ اس کے پاس نہیں آتا نہ آگے سے نہ پیچھے سے' اتاری گئی ہے حمید وحکیم کی طرف سے۔

اس آیت کریمہ نے ذکر کی خود وضاحت فرما دی کہ ذکر قرآن ہے اور قرآن کے علاوہ کوئی دوسری چیز نہیں ہے۔ البتہ ایک اشکال یہاں ذکر اور قرآن کے درمیان والی واؤ کا بھی پیدا کیا جاتا ہے کہ یہ واؤ عاطفہ ہے۔ اس لئے قرآن اور ذکر دو مختلف چیزیں ہیں لیکن صحیح بات یہ ہے کہ یہ واؤ عاطفہ نہیں ہے بلکہ یہ واؤ بیانیہ ہے جو قرآن کریم میں بکثرت واقع ہوئی ہے۔ چنانچہ ارشاد ہے:

ھو الذی ارسل رسوله بالھدی و دین الحق -(9:33)

اللہ وہ ہے جس نے اپنے رسول کو ہدایت یعنی دین حق کے ساتھ بھیجا۔

اگر اس آیت میں واؤ کو عاطفہ سمجھا جائے جو مغائرت کی متقاضی ہے تو اس کا مطلب یہ ہوگا کہ ہدایت اور چیز ہے اور دین اور چیز ہے اور دین میں ہدایت نہیں ہے جو بالبداہت غلط ہے لہٰذا یہاں واؤ' واؤ بیانیہ ہی لی جاسکتی ہے۔ اسی طرح ذکر اور قرآن کے درمیان واؤ بیانیہ تفسیر یہ ہے جس کے معنے ہیں کہ حضور ﷺ کو اللہ تعالیٰ کی طرف سے تعلیم صرف ذکر یعنی قرآن کیا گیا ہے اور حضور ﷺ کو کوئی چیز الہام یا القاء نہیں کی گئی ہے۔

ویسے بھی جو حضرات الہام یا القاء کے قائل ہیں ان کے نزدیک بھی وحی اور الہام کی مثال ایسی ہے جیسی بجلی اور موم بتی کی۔ بجلی کی موجودگی میں موم بتی کی کوئی قدر و قیمت نہیں ہے' اسی طرح جس مبارک ہستی کو وحی جیسی روشن ومنور ہدایت ملتی ہو' اسے الہام و القاء کی کیا ضرورت باقی رہ جاتی ہے۔

اس آیت کریمہ کے سلسلہ میں یہ اضافہ کرنا بھی ضروری ہے کہ یہ بات اہل علم سے مخفی نہیں کہ جب مستثنیٰ منہ مذکور نہ ہو' تو حرف استثناء حصر کا فائدہ دیتا ہے۔ اس آیت کریمہ میں بھی حرف استثناء الاحصر کا کام دے رہا ہے جس کے معنی یہ ہیں کہ ہم نے اپنے نبی کو صرف قرآن کی تعلیم دی ہے اور اس کے علاوہ کوئی تعلیم نہیں دی۔

اس طویل تمہید کے بعد اب اصل عنوان کی طرف مراجعت کی جاتی ہے یہ بات ثابت کی جا رہی ہے کہ حضور ﷺ کے پاس معلومات حاصل کرنے کے دو ہی ذرائع تھے ایک ان کی بصیرت انسانی اور دوسرے قرآن کریم۔ گذشتہ و آئندہ کے واقعات جن کا علم حضورؐ کو دیا گیا وہ بھی صرف وحی سے دیا گیا' جو صرف قرآن میں محفوظ ہے اور جن کا ذکر قرآن کریم میں آ گیا ہے۔ وحی الٰہی یعنی قرآن کریم کے علاوہ آپ کے پاس اور کوئی ذریعہ نہیں تھا جس سے آپ کو آئندہ کے واقعات کا علم ہوتا۔ رسول اللہ ﷺ قرآن کے علاوہ اور کوئی غیب کا علم نہیں رکھتے تھے۔ 72/26,3/ 179, 12/102, 11/49, 3/44, 7/188, 6/50۔

لہٰذا چونکہ حضرت امام مہدی کی آمد کا کوئی ذکر قرآن

کریم میں نہیں ہے' لہٰذا یہ نظریہ قرآن کے خلاف ہے' اور اس سلسلہ میں علماء کرام بھی کوئی آیت پیش نہیں فرماتے۔ اس مضمون کے رقم کرنے کی غایت ہی صرف یہ ہے کہ جبکہ حضور ﷺ کو آئندہ کے واقعات کا علم صرف وحی کے ذریعے دیا جاتا تھا اور وحی صرف قرآن میں محفوظ ہے' اس لئے وہ تمام باتیں جن کا ذکر قرآن میں نہیں ہے اور جو آئندہ کے واقعات کے متعلق حضور ﷺ کی طرف منسوب کی جائیں وہ وضعی اور قرآن کے خلاف ہیں۔

اس لئے آمدِ مہدی وغیرہ نظریات سب قرآن کے خلاف ہیں اور ہم مسلمانوں کے لئے بہتر یہی ہے کہ خلافِ قرآن عقائد جس قدر جلدی ترک کر دیں وہ ہمارے لئے بہتر ہے۔

☆☆☆☆

مختلف ٹی۔وی چینلز پر اس قسم کے پروگرام آ رہے ہیں جو بالکل قرآن کریم کے خلاف ہیں۔ ان میں استخارہ' بولتے ستارے قابل ذکر ہیں۔ اس کے علاوہ ARY Digital پر کئی مرتبہ ڈاکٹر شاہد مسعود صاحب نے آمد مہدی کے متعلق پروگرام کئے جس میں ڈاکٹر اسرار صاحب اور ایک شیعہ عالم نے گفتگو کی۔ گفتگو مجموعی طور پر سطحی ہے اور اس کا سارا دارومدار وضعی احادیث پر تھا۔ قرآن کریم سے مطلقاً استناد نہیں کیا گیا۔ چونکہ قرآن کریم سے کوئی استناد نہیں کیا گیا' اس لئے اس مسئلہ کے متعلق محترم خواجہ ازہر عباس صاحب کا موقف پیش کیا جاتا ہے جو کہ انہوں نے قرآن کریم کی روشنی میں تیار کیا ہے۔

(ایڈیٹر ماہنامہ طلوع اسلام)

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

ابنِ آدم

رجم کا ناقابل تردید ثبوت

اگرچہ احادیث میں یہ آیا ہے کہ جن ابنائے اسرائیل کو خنزیر اور بندر بنا دیا گیا تھا وہ تین دن سے زیادہ زندہ نہ رہے اور ان کی نسل نہ چل سکی لیکن یہ امکان ہے کہ شاید ایک آدھ جوڑا عذاب ہلاکت سے بچ گیا ہو اور اس کی نسل چل نکلی ہو اور انہوں نے آئندہ متبع شریعت رہنے کا عہد کر لیا ہو۔ معلوم ایسا ہوتا ہے کہ دنیا میں ان ہی بنی اسرائیل کی ایک شاخ باقی رہ گئی تھی جو اگرچہ رہی تو بندر ہی، لیکن ڈارون صاحب کے قانون ارتقاء کے مطابق پھر انسان بن جانے کی توقع میں باقاعدہ اتباع شریعت کا خیال رکھتے ہوں۔ چنانچہ دیکھئے دنیا کی سب سے زیادہ معتبر کتاب میں جو اصح الکتب بعد کتاب اللہ ہے، یہ روایت درج ہے کہ:

عن عمرو بن میمون، قال رأیت فی الجاھلیۃ قردۃ اجتمع علیھا قرود زنت فرجموھا فرجمتھا معھم۔

یعنی میں نے ایام جاہلیت میں ایک بندری کو دیکھا کہ بہت سے بندر اس کے گرد جمع ہیں۔ اس بندری نے زنا کیا تھا لہٰذا بندروں نے اسے رجم کیا اور میں بھی ان بندروں کے ساتھ رجم کرنے میں شریک رہا۔

ہمیں اس سے کچھ بحث نہیں ہونا چاہئے کہ: جس بندر نے اس بندری کے ساتھ زنا فرمایا تھا وہ خود کہاں بھاگ گیا اور اسے رجم (سنگسار) کیوں نہیں کیا گیا؟ ہوسکتا ہے کہ وہ کہیں نکل بھاگا ہو، یا گرفتاری سے پہلے ہی مر گیا ہو، یا بندری حاملہ پائے جانے کی وجہ سے ماخوذ ہوگئی ہو اور اس نے زانی بندر کا پتہ بتانا مناسب نہ سمجھا ہو۔

یہ تحقیق کرنے کی بھی ضرورت نہیں کہ:

وہ محصنہ تھی یا غیر منکوحہ۔ قرینہ یہ ہے کہ وہ محصنہ ہوگی اور اس کا کسی بندر سے باقاعدہ نکاح شرعی ہوا ہوگا جب ہی تو اسے رجم کیا گیا۔

اس بحث میں پڑنے کی بھی ضرورت نہیں کہ:

اس بندری نے خود ہی حلفیہ اقرار کر کے اپنی تطہیر کی خواہش ظاہر کی تھی یا دوسرے گواہوں نے شرعی عینی شہادت (کالمیل فی الکحل کی) دی تھی۔ بہرحال کچھ ہوا ہی ہوگا۔

یہ دریافت کرنے کی بھی چنداں حاجت نہیں کہ:

راوی کو بندری کے جرم زنا کی خبر عوام بندروں نے دی تھی یا بندروں کے قاضی صاحب نے۔ ظاہر ہے کہ جب

رجم ہو رہا تھا تو ایک محصنہ کے زنا ہی کی سزا میں ہو رہا ہو گا۔ اس لئے اسے قطعی قرائن سے معلوم کرنے کے بعد راوی نے بھی اس نیکی میں شرکت کرنے کے لئے رجم میں ساتھ دے دیا۔

بہرکیف خواہ مخواہ ان شبہات میں پڑنے کی ضرورت نہیں۔ دیکھنا تو صرف یہ ہے کہ رجم زانی ایک ایسی فطری سزا ہے جو بندروں تک میں مقبول ہے۔ مگر یہ اشرف المخلوقات انسان عجیب مخلوق ہے جو بندروں سے ایک دو درجے اوپر ہونے کے باوجود اس سزا کو نافذ کرنے سے ہچکچاتا ہے حالانکہ صاف صاف قرآن کی آیت موجود ہے کہ:

الشیخ والشیخۃ اذا زنیا فارجموھما البتۃ الخ

شیخ اور شیخہ زنا کریں تو ان دونوں کو قطعاً رجم کر دو۔

اور یہ بھی سب جانتے ہیں کہ شیخ اور شیخہ کے معنی لغت عرب میں محصن اور محصنہ ہی کے ہیں۔

آپ زیادہ سے زیادہ یہی پوچھ سکتے ہیں کہ یہ کس پارے، کس سورہ اور کس رکوع کی آیت ہے؟ لیکن یہ کیا ضرور ہے کہ جس آیت کا صحیح حوالہ نہ دیا جا سکے وہ آیت ہی نہ ہو۔ آخر ایسی بھی تو آیتیں ہیں نا جو قرآن میں اگرچہ موجود نہیں لیکن ہیں وہ آیتیں۔

اس فقرے کے آیتِ قرآنی ہونے کا سب سے بڑا ثبوت یہ ہے کہ (بروایت ابن عباسؓ) حضرت عمرؓ نے فرمایا ہے کہ:

اگر مجھے یہ خوف نہ ہوتا کہ لوگ کہیں گے کہ عمر نے قرآن میں اضافہ کر دیا تو میں اس آیت کو ضرور داخلِ قرآن کر دیتا (رواہ الخمسہ)

آپ اس پر صرف یہی شبہ وارد کر سکتے ہیں کہ اگر یہ آیت قرآن میں موجود نہیں تو قرآن کی محفوظیت کا دعویٰ کیونکر صحیح ہوا ہے لیکن یہ بھی دیکھنا چاہئے کہ محفوظیت کے یہ معنی تو نہیں کہ قرآن کے اندر ہی محفوظ ہو۔ محفوظ ہونا چاہئے خواہ کسی جگہ ہو۔ چنانچہ یہ آیت رجم بھی احادیث میں محفوظ ہے۔ انا لہٗ لحٰفظون میں اب کیا شبہ رہ جاتا ہے؟

حمیدی فرماتے ہیں کہ غالباً یہ روایت (کہ بندروں نے بندری کو سنگسار کیا) بخاری میں الحاق کر دی گئی ہے۔ لیکن ہم لوگوں کو اصح الکتب بعد کتاب اللہ الباری کے متعلق ہرگز ایسے سوئے ظن سے کام نہیں لینا چاہئے کہ اس میں کوئی روایت الحاقی بھی ہو گی۔ قرآن سے کسی آیت کا (آیت رجم کی طرح) غائب ہو جانا اور نہ لکھا جانا تو سمجھ میں آ سکتا ہے لیکن یہ بات کسی طرح سمجھ میں نہیں آ سکتی کہ اصح الکتب میں کوئی روایت الحاق کر دی گئی ہو گی۔ درانحالیکہ امام بخاریؒ نے بقول حمیدی تاریخِ کبیر میں بھی یہ روایت نقل فرمائی ہے۔ فرق صرف اتنا ہے کہ اس میں قد زنت (اس بندری نے زنا کیا تھا) کا لفظ نہیں۔۔۔۔ حمیدی نے اس روایت کو الحاق بتانے کی تکلیف بے کار کی ہے۔ جب انسان نے جانوروں سے اتنا کچھ اور سیکھا ہے تو کچھ بندر بھی یہ بتا سکتے ہیں کہ دیکھو شریعت موسوی (یا آئندہ نازل ہونے والی آیت رجم) پر اس طرح عمل کیا جاتا ہے۔

کیا اب بھی آپ کو رجم کے اسلامی سزا ہونے میں شک ہے؟

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

تبصرۂ کتب

کتاب : بڑا آدمی کون؟
مصنفہ : ثریا کوثر قیصرانی
تبصرہ نگار : محمد سلیم اختر
قیمت : 70 روپے
ناشر : مثال پبلشنگ۔ 22A، حبیب بینک بلڈنگ، چوک اردو بازار، لاہور۔

☆☆☆

بچوں کے لئے مختصر کہانیوں کا یہ مجموعہ محترمہ ثریا کوثر قیصرانی کی کاوش ہے۔

ہمارے ہاں بچوں کے لئے انہی کے ذہنی معیار کو سامنے رکھ کر بہت کم لٹریچر لکھا گیا ہے۔ اردو زبان میں تحریر کی گئی کہانیوں میں چونکہ کردار بالعموم جنوں، پریوں، دیو، بھوت پریتوں، بادشاہوں، شہزادوں، شہزادیوں یا پھر جانوروں کی دنیا کے باسی ہوتے ہیں سو اِن سے کردار سازی کے حوالہ سے کوئی فائدہ ہونا تقریباً ناممکن سی بات ہے۔

اخلاقی اور اصلاحی حوالہ سے دو طرح کے کام ملتے ہیں۔ ایک تو مذہبی کتابیں ہیں جن کے مؤلفین اپنے اسلامی جوش و جذبہ میں معلومات کی اس قدر بھرمار کر دیتے ہیں کہ وہ بے حد مفید ہونے کے باوجود بچوں کے لئے اپنی دلچسپی برقرار نہیں رکھ پاتیں حالانکہ ان میں سے اکثر میں زبان بھی سادہ اور عام فہم استعمال ہوئی ہے۔ دوسرے وہ کتابیں ہیں کہ جن کے کردار یا تو مافوق الفطرت ہوتے ہیں یا پھر ہمارے معاشرے اور معاشرتی اقدار سے اُن کا کوئی تعلق واسطہ نہیں بنتا۔

ثریا کوثر قیصرانی نے ایسی کہانیوں کا مجموعہ تیار کیا کہ جن کے کردار ہر گھر میں دیکھے جا سکتے ہیں۔ زبان اتنی سادہ رکھی ہے کہ دوسری جماعت کے طالبعلم بھی بخوبی پڑھ اور سمجھ سکیں۔ اگرچہ ہر کہانی کسی خاص مستقل قدر کو اجاگر کرتی ہے لیکن اس کے باوجود یہ روایتی انداز کی مذہبی کتاب بھی نہیں ہے۔

اس مجموعہ کی ایک خوبی یہ بھی ہے کہ اکثر کہانیاں اس انداز سے تحریر کی گئی ہیں کہ اساتذہ یا والدین کی تھوڑی سی راہنمائی سے انہیں ڈرامہ کی صورت میں پیش کیا جا سکتا ہے۔

خوبصورت اور چار رنگوں میں تیار کیا گیا ٹائٹل، مضبوط جلد بندی، اعلیٰ سفید کاغذ اور ہر صفحہ پر دو رنگ کی چھپائی اس کتاب کو مزید دلکش بنانے کا سبب ہیں۔ بچوں کی نفسیات کو پیشِ نظر رکھتے ہوئے ہر صفحے کو بارڈر سے مزین کیا گیا ہے۔ طباعت انتہائی معیاری ہے۔ کتاب ''طلوع اسلام ٹرسٹ''

سے بھی حاصل کی جاسکتی ہے۔

☆☆☆☆☆☆☆

کتاب : ابنِ مریم' پرویز اور طاہر سورتی

مصنف : عصمت ابوسلیم

صفحات : 102

خصوصی قیمت : 20 روپے

ناشر : سرسید میموریل لائبریری' کالج سٹاپ' جی ٹی روڈ' باغبانپورہ' لاہور۔

مبصر : شیخ اللہ دتا

☆☆☆

زیرنظر کتاب ''ابنِ مریم'' محترم عصمت ابو سلیم کی تصنیف ہے جو علامہ عبدالرحمن طاہر سورتی مرحوم کی کتاب ''ابن مریم اور پرویز'' کا ناقدانہ جائزہ ہے۔ علامہ مرحوم ایک ایسے علمی گھرانہ کے چشم و چراغ تھے جو ہندوستان میں اہلحدیث مکتبہ فکر کا علمبردار تھا۔ ان کے والد گرامی علامہ محمد سورتی (وفات 1361ھ) اہلحدیث علمائے ہند میں بلند مرتبہ ومقام رکھتے تھے۔ علامہ عبدالرحمن طاہر سورتی مرحوم خود بھی عربی کے فاضل تھے اور عربی زبان ولغت پر ان کی گہری نظر تھی۔ پاکستان میں عربی زبان کی ترویج کے لئے انہوں نے ''پیارے نبیؐ کی پیاری زبان'' کے نام سے کئی حصوں پر مشتمل ایک منفرد کورس تیار کیا جو چھپ کر عوام اور عربی کے طلباء کے لئے بڑا مفید ثابت ہوا۔ انہوں نے انجمن ترقی عربی (پاکستان) کی بنیاد بھی رکھی' جس کی خدمات قابل قدر ہیں۔

کتاب ''ابن مریم اور پرویز'' علامہ طاہر سورتی مرحوم کی تصنیف ہے جس میں انہوں نے علامہ غلام احمد پرویز مرحوم (وفات 1984ء) کی کتاب ''شعلۂ مستور'' میں دی گئی ان کی قرآنی تصریحات وتشریحات پر گرفت کی ہے جو ان کے نزدیک صحیح نہ تھے۔ یہ کتاب المکتبہ العلمیہ' 15 لیک روڈ' لاہور نے شائع کی تھی جس کے مدیر نے علامہ طاہر سورتی کے تعارف میں لکھا ہے کہ پرویز صاحب نے اپنی لغات القرآن آخر میں آپ ہی سے نظرثانی کرائی' اس طرح انہیں پرویز صاحب کے لٹریچر کے مطالعہ وتجزیہ کا موقعہ ملا۔ نظرثانی کرانے کا معاملہ تو واضح طور پر محل نظر ہے کیونکہ نظرثانی تو درستی کے لئے ہوتی ہے جو نہیں ہوئی کیونکہ انہوں نے الگ سے اختلافی امور کو اٹھایا ہے۔ یہ ممکن ہے کہ انہوں نے پروف ریڈنگ وغیرہ میں حصہ لیا ہو۔

علامہ غلام احمد پرویز گزشتہ صدی کی متنازع سہی لیکن بلاشبہ ایک بہت بڑی شخصیت تھے' جنہوں نے عہد ساز اثرات چھوڑے ہیں۔ عربیت میں وہ اپنے ابتدائی اساتذہ کے علاوہ علامہ حافظ محمد اسلم جیراجپوریؒ سے مستفید ہوئے۔ اس لئے ان کی تنقیحات کو یک قلم مسترد کرنے میں تامل ہونا چاہئے۔ بہرحال علامہ طاہر سورتی نے جو نکات اٹھائے ہیں ان پر محترم عصمت ابوسلیم نے ماہرانہ گرفت کی ہے اور ان کا ناقدانہ جائزہ لیا ہے۔

محترم عصمت ابوسلیم بھی عربی زبان ولغت کے بڑے آشنا ہیں۔ پنجاب یونیورسٹی سے ایم اے عربی ہیں' پاکستان میں عراقی سفارت خانہ میں قریب دس سال تک مترجم کے فرائض انجام دیئے ہیں۔ عربی اردو انگریزی مجلہ

اخبار العرب میں دو سال تک اردو سے عربی میں ترجمہ اور تبیین کا فریضہ بھی سرانجام دیا ہے۔ ان کے کئی تحقیقی مقالات ملکی رسالوں میں شائع ہو کر خراج تحسین حاصل کر چکے ہیں۔ وہ اس وقت ستر کے پیٹے میں ہیں' قرآن کریم کے ترجمہ وتفسیر میں خصوصاً عربی گرامر کے حوالہ سے خاصی مہارت رکھتے ہیں۔ ان کی علامہ طاہر سورتی کے استدلال پر گرفت خاصی اہم اور اکثر مقامات پر مسکت ہے۔

''ابن مریم'' کی اشاعت کے وقت علامہ عبدالرحمن طاہر سورتیؒ اور علامہ غلام احمد پرویزؒ دونوں مرحوم ہو چکے ہیں اس لئے اس ناقدانہ تبصرہ کی توثیق یا تنقیص کی پوزیشن میں نہیں۔ اس وقت قاری کی بصیرت سے ہی اس کی توقع کی جاسکتی ہے کہ وہ قرآنی آیات کا خود جائزہ لے لیکن پہلے سے قائم عقائد کی عینک اتار کر جانچے اور دیانتدارانہ فیصلہ کرے۔

مجھے حضرت عیسیٰؑ کے بن باپ پیدا ہونے کے عقیدہ اور مروج تشریحات سے خاصی آشنائی ہے۔ مفسرین نے دور از کار باتیں بھی کی ہیں۔ اس سے قبل ایک جید اہلحدیث عالم حافظ عنایتؒ اللہ اثری گجراتی ثم وزیر آبادی نے بھی احادیث کی رو سے ثابت کیا ہے کہ حضرت عیسیٰؑ بن باپ کے پیدا نہ ہوئے تھے۔ ان کی وقیع تشریحات کو ان کی کتاب ''عیون زمزم'' میں ملاحظہ کیا جا سکتا ہے۔ اب ان کے شاگرد علامہ عبدالکریم اثری اس بات کے داعی ہیں۔

بات اہلحدیث' اہل سنت یا دیگر مکتبہ ہائے فکر کے نقطہ نظر کی نہیں بلکہ ہمیں دیکھنا یہ ہے کہ اس عقیدہ کا قرآن کریم کی روشنی میں جائزہ ہمیں کس مقام پر پہنچاتا ہے۔ محترم قاری حضرات سے التماس ہے کہ آپ شعلۂ مستور' ابن مریم اور پرویز' زیر نظر کتاب ابن مریم اور ممکن ہو تو ''عیون زمزم'' کا مطالعہ کریں اور پھر نئے سرے سے حدیث مبارکہ:

...ان عیسیٰ حملته امه کما تحمل المرأة ثم وضعته کما تضع المرأة ولدها ثم غذی کما تغذی المرأة الصبی...

(مریم کو اسی طرح حمل ہوا جس طرح سارے جہان کی عورتوں کو حمل ہوا کرتا ہے اور پھر اس نے اسے اسی طرح وضع کیا جیسے کہ عورتیں اپنے اپنے حملوں کو وضع کیا کرتی ہیں اور پھر اسی طرح دودھ پلا کر پرورش کیا جیسے دیگر عورتیں اپنے بچوں کو دودھ پلا کر پرورش کیا کرتی ہیں' کوئی خصوصیت نہیں)۔ (درمنثور۔ مسجد نبوی میں عیسائیوں سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا مناظرہ' منقول بہ ابنِ جریر والی حاتم)۔ (عیونِ زمزم' صفحہ 105-106)۔

اور سورہ مریم کی قرآنی آیات نمبر 16 تا 34 کا از خود مطالعہ کریں جس کا اختتام اس پر ہوتا ہے:

ذالک عیسیٰ ابن مریم ج قول الحق الذی فیه یمترون O

ترجمہ: یہ عیسیٰ ابن مریم ہیں' ایسی حق کی بات جس کے بارے میں لوگ اختلاف کر رہے ہیں۔